تدبّر

زیرِ نگرانی

مولانا امین احسن اصلاحی

یکے از مطبوعات

ادارہ تدبّرِ قرآن و حدیث

رحمان سٹریٹ مسلم کالونی سمن آباد، لاہور

مجلس ترتیب

خالد مسعود (مدیر)

جاوید احمد

عبداللہ غلام احمد

ماجد خاور

ناشر: ادارۂ تدبر قرآن وحدیث

مطبع: المطبعۃ العربیہ پرانی انارکلی لاہور

قیمت: تین روپے

تدبّر

سلسلہ نمبر ۶ — جمادی الاول ۱۴۰۳ھ — فروری ۱۹۸۳ء

فہرست مضامین

تذکرہ وتبصرہ

وقت کی ایک اہم ضرورت ——— خالد مسعود ۳

تدبر قرآن

سورۂ بقرہ (۶) ——— خالد مسعود ۷

فہم قرآن کے چند بنیادی اصول (۵) ——— امین احسن اصلاحی/عبداللہ غلام احمد ۱۲

تدبر حدیث

فرائض دین کی پابندی کا مسئلہ ——— خالد مسعود ۲۰

اصول تدبر حدیث

قرآن اور حدیث وسنت کا باہمی تعلق ——— امین احسن اصلاحی/ماجد خاور ۳۰

تزکیۂ نفس

تعلق باللہ اور اس کی اساسات (۶) ——— امین احسن اصلاحی ۴۰

مراسلہ ومذاکرہ

تصوف، اسلام کے متوازی ایک دین ہے ـ امین احسن اصلاحی/بشیر احمد ۴۶

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ وتبصرہ

خالد مسعود

وقت کی ایک اہم ضرورت

قوموں کی عالمی برادری میں امتِ مسلمہ پر جو زبوں حالی طاری ہے اور اسے جن مسائل کا سامنا ہے ان کا تذکرہ ہمارے عوام وخواص کی زبانوں پر ہے۔ ہر دردمند مسلمان اس کے لئے متفکر ہے اور چاہتا ہے کہ ملت کے تحفظ اور استحکام کے لیے جو کچھ اس کے بس میں ہو اُسے کر گزرے۔ لیکن اس مقصد کے لیے سب سے زیادہ اہم کام کونسا ہے؟ اس سوال کے جواب میں رائیں الگ الگ ہیں۔ بعض لوگ مسلمان ممالک کے مادی وسائل کو ترقی دینے اور ان کو مجتمع کرنے کی ضرورت کے قائل ہیں۔ بعض اسلامی ممالک کے بلاک کے قیام کو امتِ مسلمہ کے مسائل کا حل بتاتے ہیں۔ ایک طبقہ زمانے کی تہذیبی دوڑ میں مسلمانوں کے پیچھے رہ جانے کو اس کی زبوں حالی کا بنیادی سبب قرار دے کر یہ تجویز کرتا ہے کہ مسلمان مغربی تہذیب وتمدن کو اپنائیں۔ دوسرا طبقہ اس کے برعکس دین کی کمزوری کو اصل سبب گردانتا ہے۔ اس کے نزدیک دینی درسگاہیں، لائبریریاں اور تبلیغی ادارے قائم کر کے اس دور کے چیلنج کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔

یہ سوال کہ ملت کے تحفظ کے نقطۂ نظر سے اس وقت سب سے بڑی ضرورت کیا ہے، ادارہ تدبر قرآن وحدیث کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے ایک اجتماع میں ادارہ کے صدر مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہٗ کی تقریر کا موضوع تھا۔ آپ نے اس مسئلہ پر سیر حاصل گفتگو کی۔ آپ نے فرمایا:

"ماضی قریب کی تاریخ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جب مغرب کے فکرہ فلسفہ نے ہماری ملت کو چیلنج کیا ہے تو اس کے باوجود کہ ہمارے ہاں مسجدیں اور خانقاہیں آباد تھیں، مدرسے اور کتب خانے بڑی تعداد میں موجود تھے، تبلیغی ادارے قائم تھے، یہ چیزیں ملت کو بچا نہ سکیں۔ مغربی تہذیب کا جو سیلاب آیا وہ ملت کے تمام آثار کو اپنے ساتھ بہا لے گیا۔ جس کے نتیجہ میں ساری اسلامی اقدار تلپٹ ہو گئیں، پیمانے بدل گئے، مذہب کی جن چیزوں کی بڑی عزت ووقعت تھی ان چیزوں کو حقارت سے دیکھا جانے لگا اور جن چیزوں

سے ہم نفرت کرتے اور اپنے دین، مذہب اور روایات کے خلاف سمجھتے تھے وہ ہمارے اندر گھس آئیں۔ مغربی زندگی کی تمام وبائیں اور آفتیں قوم پر مسلط کر دی گئیں۔ ہمارے عوام و خواص، علماء و فقہاء اور مدرسوں اور خانقاہوں والے سب کے سب اس سیلاب میں بہہ گئے۔"

مولانا نے تاشقند، بخارا اور سمرقند کے مسلمانوں پر روسیوں کی یلغار کا حوالہ دیا اور بتایا کہ وہاں کے مدرسے، خانقاہیں اور بخاری شریف کے ختم ملت کا تحفظ نہ کر سکے۔ ترکی میں خلافت کے خاتمہ کے بعد کے حالات کا جائزہ لیتے ہوئے آپ نے بتایا کہ مغربی تہذیب کے سیلاب نے وہاں اسلامی قانون کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیا۔ اس کی جگہ سوئٹزرلینڈ کا پرسنل لا نافذ کیا گیا، تعزیرات میں اٹلی کی نقالی کی گئی، تجارت کا قانون یورپی اقوام سے لے لیا گیا اور اس طرح مغربی تہذیب کی تمام آفتیں ترکی کے مسلم معاشرہ میں سرایت کر گئیں۔ قوم کو اس حادثہ سے دوچار کرنے میں کوئی بیرونی طاقت دخیل نہ تھی۔ بلکہ یہ سب اپنے ہی بھائیوں کے ہاتھوں پیش آیا اور ملت کے صدیوں کے آثار مٹا دینے کا باعث بنا۔

اس صورتِ حال کے اسباب کا تجزیہ کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا:

"جو چیز قوم کا تحفظ کرتی ہے وہ ان کا خودی کا شعور ہوتا ہے کہ ہم کیا ہیں اور دنیا میں کس لئے آئے ہیں، ہمیں دنیا میں کیا کرنا ہے اور کس مقصد کے لئے جینا ہے؛ خودی کے یقین و اذعان سے ایک قوم، قوم بنتی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہمارے علماء اپنے ملکوں کے ذہین اور باشعور طبقہ کے اندر خودداری، انا اور ملت کا درد باقی نہ رکھ سکے۔ یہ چیز مذہب کے خالی نعروں سے باقی نہ رہ سکتی تھی۔ بلکہ اس کے لئے دین کی محبت اور شریعت کی حکمت و قوت کو واضح کرنا ضروری تھا۔ یہ چیز ذہین طبقہ کے رگ و پے میں جاری و ساری ہوتی اور ان کے خون میں حرارت پیدا کرتی تو وہ مغربی تہذیب کے چیلنج کا مقابلہ کر سکتے۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ ایسے بے جان مذہب کو جس کے متعلق لوگوں کا تصور یہ ہو کہ بس مان لینے کی چیز ہے، لوگ اسی وقت تک مانتے ہیں جب تک کوئی چیلنج پیش نہیں آتا۔ جب حقیقی چیلنج پیش آتے تو انٹلی جنشیا بے بسی محسوس کرتا ہے اور جب وہ ہتھیار ڈال دیتا ہے تو عوام از خود اس سیلاب میں بہہ جاتے ہیں۔"

مولانا نے اسلام کے ماضی کی طرف توجہ مبذول کراتے ہوئے سوال کیا کہ اسلام کی وہ قوت کیا ہوئی جس نے مصر، فارس اور روم کی تہذیب کے طنطنے کو پامال کر کے رکھ دیا تھا؟ عربوں کی تلوار

اتنی زوردار تو نہ تھی کہ وہ اس کا مقابلہ نہ کر سکتے تھے۔ تلوار تو ایرانیوں اور رومیوں کی بھی زوردار تھی لیکن وہ قرآن کی محبت اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کی بدولت عربوں کے فکر و فلسفہ میں آنے والی تبدیلی کا مقابلہ نہ کر سکے۔ عربوں نے انہیں نئے تمدن، نئے تصورِ زندگی اور نئے نظریات سے اس قوت اور دبدبے کے ساتھ آگاہ کیا کہ سب کو اپنا معتقد بنا لیا۔

مولانا نے عربوں کی طاقت کے سرچشمہ کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا:

"ہمارے علم کا منبع اور فکر و فلسفہ کا سرچشمہ قرآن مجید تھا، اس عظیم خزانہ اور عظیم قوت سے ہم بے خبر ہو گئے۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن نے تخلیقِ آدم کی غایت واضح کی ہے، انسان کا مرتبہ و مقام متعین کیا ہے، انسان اور خدا کے تعلق کی اساسات نمایاں کی ہیں، انسان کی اجتماعی و سیاسی زندگی کے اصول بتائے ہیں، عائلی زندگی کی بنیادیں استوار کی ہیں اور اس تمام فلسفہ و فکر کی بنیاد عقل و فطرت، کائنات کے نظام اور آفاق و انفس کے دلائل پر رکھی ہے۔ اس کی ہر ہدایت مضبوط حکمت پر قائم ہے۔ لیکن ہم نے اس کتاب پر غور و فکر کرنا اور اس سے رہنمائی حاصل کرنا ضروری نہ سمجھا اور اپنی بے شعوری اور حقائق سے غفلت کے سبب سے تباہی کے گڑھے میں جا گرے۔"

مولانا نے متنبہ کیا کہ اس وقت ہمارا ملک بھی میزان میں ہے۔ حالات ایسے ہیں کہ وہ دَور قریب آتا محسوس ہو رہا ہے جس میں کوئی فیصلہ ہو جائے گا۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں بھی وہی کمی محسوس ہو رہی ہے جو دوسرے ممالک کے مسلمانوں میں تھی۔ ہم اپنے خزانہ، اسلحہ، طاقت اور دین کی محبت سے بے خبر ہیں۔ اس سے باخبر کرنے والے لوگ بھی موجود نہیں۔ اس وقت ملت کے تحفظ کے نقطۂ نظر سے یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ وقت کی سب سے بڑی ضرورت کیا ہے جس کو سب سے پہلے مہیا کرنا قوم کو زندہ و باقی رکھنے کے لئے ضروری ہے۔

وقت کی اس اہم ضرورت کی نشان دہی کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا:

"ہمیں اللہ کی کتاب کی جو نعمت حاصل ہے اس کے اصلی خزانے سے واقف ہونا اور اس کے فکر کو اپنانا سب سے ضروری کام ہے۔ اس کا اہتمام جب تک نہ ہوگا تو آپ جو چیزیں بھی مہیا کریں گے وہ موجود ہو کر بھی غیر موجود رہیں گی اور قوم کو ان کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ کرنے کا کام یہ ہے کہ ایسی تدابیر اختیار کریں کہ قرآن کا صحیح فکر و فلسفہ لوگوں کے سامنے آئے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ قوم کے اندر سے نوجوانوں کا ایک ایسا طبقہ تیار کیا جائے جو قرآن مجید کے صحیح فکر و فلسفہ سے پوری طرح واقف اور موجودہ زمانے کے فلسفہ سے بھی اچھی طرح آگاہ ہو تاکہ حق و باطل

میں نہ صرف امتیاز کر سکے بلکہ ہر بات کی حکمت کو اجاگر کر سکے اور دین کی حجت کو اس طرح پیش کرے کہ ملک کا انٹیلی جنٹسیا اس سے متاثر ہو سکے۔ یہ ایک عظیم کام ہے جو پوری قوم کے مل کر کرنے کا ہے۔ لیکن اگر قوم میں یہ شعور پیدا نہ ہو تو جن لوگوں میں اس ضرورت کا احساس پیدا ہو جائے ان کو یہ کام کرنا چاہیے۔

اس میں شبہ نہیں کہ اُمتِ مسلمہ کو جو شرف حاصل ہے وہ قرآن مجید کی امانت ہی کی بدولت ہے۔ اسے اس بات سے بھی آگاہ کر دیا گیا ہے کہ اس کا عروج و زوال اسی امانت کا حق ادا کرنے یا نہ کرنے ہی پر منحصر ہے۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس وقت قرآنِ مجید ہی وہ مظلوم کتاب ہے جس کو سمجھنے اور اس پر غور و تدبر کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی جاتی، اس لئے اس کتاب کا تعلق مسلمان معاشرے کی عملی زندگی سے بڑی حد تک منقطع ہو چکا ہے۔ قرآن کے حقوق سے بے بہرہ امتِ مسلمہ کو اگر آسمانی تحفظ حاصل نہ ہو اور اسے مخالف اقوام کی چیرہ دستیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے چھوڑ دیا جائے تو اس میں کوئی تعجب نہیں ہونا چاہیے۔ ہم سیم و تھور کے مسائل کو حل کرنے کے منصوبے بناتے ہیں۔ توانائی کی کمی کو دور کرنے کے لئے ضروری اقدامات کرتے ہیں۔ سال بھر آبپاشی کے وسائل کو کارآمد بنانے کے انتظامات کرتے ہیں۔ تعلیمی اور ثقافتی میدان میں قلیل المیعاد اور طویل المیعاد اسکیمیں نافذ کرتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ قومی سطح پر ہم نے اُمت کے فرضِ منصبی کو ادا کرنے کے لئے کسی اسکیم کا اجرا نہیں کیا۔ انفرادی سطح پر قرآنی فکر کی ترویج کی جو کوششیں ہو رہی ہیں ظاہر ہے کہ وہ بہت محدود ہیں اور قوم کو اس کے فرض سے سبکدوش نہیں کر سکتیں۔ ضرورت ہے کہ مولانا محترم کے خیالات کو واقعی اہمیت دی جائے اور ملی تحفظ کا اہتمام کیا جائے۔

تدبرِ قرآن

خالدہ مسعود

سُورۂ بقرہ (٦)

ہم آسمان کی طرف تمہارے رُخ کی گردش دیکھتے رہے ہیں۔ سو ہم نے فیصلہ کر لیا ہے کہ ہم تمہیں اس قبلہ کی طرف پھیر دیں جس کو تم پسند کرتے ہو۔ تو تم اپنا رُخ مسجدِ حرام کی طرف کرو اور جہاں کہیں بھی تم ہو تو اپنے رُخ اسی کی طرف کرو۔ جن لوگوں کو کتاب ملی، وہ جانتے ہیں کہ یہی اُن کے رب کی جانب سے حق ہے اور جو کچھ وہ کر رہے ہیں، اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے ○ اور اگر تم اہلِ کتاب کے سامنے ہر قسم کی نشانیاں بھی پیش کر دو تو بھی یہ تمہارے قبلہ کی پیروی نہیں کریں گے اور نہ تم ان کے قبلہ کی پیروی کرنے والے بن سکتے اور نہ وہ ایک دوسرے کے قبلہ کی پیروی کرنے والے بن سکتے اور اگر تم اس علم کے بعد جو تمہارے پاس آ چکا ہے ان کی خواہشوں کی پیروی کرو گے تو بلاشبہ تم ظالموں میں سے ہو جاؤ گے ○ جن کو ہم نے کتاب عنایت کی ہے وہ اس کو پہچانتے ہیں جیسا کہ اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں ○ البتہ ان میں ایک گروہ ہے جو جانتے بوجھتے حق کو چھپاتا ہے ○ یہی حق ہے تمہارے رب کی جانب سے، تو تم شک کرنے والوں میں سے نہ بن جانا ○ ١٤٧

مکہ میں آں حضرتؐ کے لئے دونوں قبلوں کو جمع کرنا ممکن تھا لیکن مدینہ ہجرت فرما جانے کے بعد یہ صورت نہ رہی۔ اس وجہ سے قبلۂ ابراہیمی سے انقطاع آپ کو شاق گزرنے لگا۔ جب آپ پر واضح ہوا کہ حضرت ابراہیمؑ کا قبلہ تمام اولادِ ابراہیم کا مشترکہ قبلہ ہے تو برابر آپ کو تحویلِ قبلہ کا انتظار رہنے لگا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کا فیصلہ فرما کر مسجدِ حرام کی طرف رُخ کرنے کا حکم دے دیا۔

یہود و نصاریٰ بیت المقدس سے باہر نکل کر مشرق و مغرب کی سمت کو قبلہ بنا لیتے تھے۔ اس امت کو حکم دیا کہ مسجدِ حرام کے اندر یا باہر تمہارا رخ اس معین قبلہ ہی کی طرف ہونا چاہیے۔

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی ہے کہ قبلہ کے معاملہ میں اہلِ کتاب کا ردِ عمل کسی شک و شبہ کی بنا پر نہیں ہے بلکہ دیدہ و دانستہ محض ضد و عناد اور حسد کی بنا پر ہے۔

یعنی جس طرح ایک مجبور باپ اپنے دور افتادہ بیٹے کے لئے پریشان و مضطرب رہتا ہے اور ایک مدت کی جدائی کے بعد جب وہ آتا ہے تو دور سے اس کے پیراہن کی خوشبو اس کے لئے نویدِ مسرت لاتی ہے۔ اسی طرح صالحینِ اہلِ کتاب قرآنِ مجید اور اس کے بیان کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

ہر ایک کے لئے ایک سمت ہے وہ اسی کی طرف رُخ کرنے والا ہے۔ تو تم نیکیوں کی راہ میں سبقت کرو۔ جہاں کہیں بھی تم ہوگے اللہ تم سب کو جمع کرے گا۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۝ اور جہاں کہیں سے بھی تم نکلو تو اپنا رُخ مسجد حرام ہی کی طرف کرو۔ بے شک یہی حق ہے تمہارے رب کی جانب سے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے ۝ ۱۴۹

اور جہاں کہیں سے بھی نکلو تو اپنا رُخ مسجدِ حرام ہی کی طرف کرو اور جہاں کہیں بھی تم ہو تو اپنے رُخ اسی کی جانب کرو۔ تاکہ لوگوں کے لئے تمہارے خلاف کوئی حجت باقی نہ رہے، مگر جو اُن میں سے ظالم ہیں۔ تو ان سے نہ ڈرو مجھی سے ڈرو اور تاکہ میں اپنی نعمت تم پر تمام کروں اور تاکہ تم راہ یاب ہو ۝ چنانچہ ہم نے تم میں ایک رسول بھیجا تم ہی میں سے جو تمہیں ہماری آیتیں پڑھ کر سناتا اور تمہیں پاک کرتا ہے اور تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور تمہیں ان چیزوں کی تعلیم دیتا ہے جو تم نہیں جانتے تھے ۝ تو تم مجھے یاد رکھو، میں تمہیں یاد رکھوں گا۔ میری شکرگزاری کرتے رہنا، میری ناشکری نہ کرنا ۝ ۱۵۲

یعنی یہود و نصاریٰ نے اپنے اپنے قبلہ کے لئے ایک سمت ٹھہرالی ہے یہ اسی جہت کو قبلہ بنائیں گے۔

قبلہ جدید یت و انابت اور فلاح و سعادت کی جدوجہد میں مقابلہ کے لئے خدا کا مقرر کردہ ایک نشان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس نشانِ حق کو امتِ وسط کیلئے پھر نمایاں کیا اور فرمایا کہ تم حصولِ سعادت کی راہ میں آگے بڑھنے کی کوشش کرو۔ کیونکہ اس قبلہ کی عظیم روایات ہی دنیا کی روحانی و ایمانی زندگی کا واحد ذریعہ ہیں۔

اگرچہ سفر کی حالت میں تعیینِ قبلہ کی جستجو اور تحقیق ایک دشوار کام ہے، لیکن حضر کی طرح سفر میں بھی قبلہ کا اہتمام ضروری ہے تاکہ امت اپنے نصب العین سے سہل انگاری میں مبتلا نہ ہونے پائے۔

احکام کے دہرانے سے مقصود تکرار نہیں بلکہ ان کی تین عظیم حکمتوں اور مصلحتوں کو بیان کرنا ہے۔

یعنی قبلہ کے اشتراک کی وجہ سے اہلِ کتاب بالخصوص یہود کو تمہارے خلاف بدگمانی پھیلانے کے لئے کوئی موقع نہ ملے۔

مراد تکمیلِ دین کی نعمت ہے جس کی پیش گوئی سابق انبیاء نے اس امت کے بارے میں فرمائی تھی۔

یعنی تحویلِ قبلہ کی طرح اتمامِ نعمت اور ملتِ ابراہیم کی طرف رہنمائی کے لئے ہم نے وہ پیغمبر بھی بھیج دیا جس کی بعثت کی دعا حضرت ابراہیمؑ نے کی تھی۔

اہلِ کتاب کی معزولی اور مسلمانوں کو ایک مستقل اُمت کی حیثیت سے ممتاز کرنے کے بعد مسلمانوں کو یہ ایک یاد دہانی کرائی ہے جس کی نوعیت اللہ تعالیٰ اور امتِ مسلمہ کے درمیان ایک عظیم معاہدے کی ہے۔

اے ایمان والو، ثابت قدمی اور نماز سے مدد چاہو۔ بے شک اللہ ثابت قدموں کے ساتھ ہے ۝ اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوتے ہیں ان کو مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم محسوس نہیں کرتے ۝ بیشک ہم تمہارا امتحان کریں گے کسی قدر خوف، بھوک اور مالوں اور جانوں اور پھلوں کی کمی سے اور ان ثابت قدموں کو خوشخبری سنا دو ۝ جن کا حال یہ ہے کہ جب ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ بے شک ہم اللہ ہی کے لئے ہیں اور اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں ۝ یہی لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی عنایتیں ہیں اور رحمت اور یہی لوگ راہ یاب ہونے والے ہیں ۝ ۱۵۷

بیشک صفا اور مروہ اللہ کے شعائر میں سے ہیں تو جو بیت اللہ کا حج کرے یا عمرہ کرے تو اس پر کوئی حرج نہیں کہ ان کا طواف کرے اور جس نے کوئی نیکی خوش دلی کے ساتھ کی تو اللہ قبول کرنے والا اور جاننے والا ہے ۝ بے شک جو لوگ چھپاتے ہیں ہماری اتاری ہوئی کھلی کھلی نشانیوں اور ہماری ہدایت کو، بعد اس کے کہ ہم نے وہ کتاب میں کھول کر لوگوں کے لئے بیان کر دی تھیں تو وہی لوگ ہیں جن پر اللہ لعنت

مسلمانوں کو ایک مستقل امت کی حیثیت سے نمایاں کر دینے کے بعد یہود اور مشرکین کی طرف سے ان کو جو خطرات پیش آسکتے تھے، ان کے مقابلہ کیلئے یہ ہدایات دی ہیں۔

یہ زندگی اور موت کے متعلق صحیح اسلامی تصور دیا ہے کہ مومن کے نزدیک اصل زندگی کا آغاز اس وقت ہوتا ہے، جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوتا ہے۔ اہلِ ایمان عالمِ برزخ میں بھی اپنے مراتب و مدارج کے لحاظ سے مسرور و شادکام ہوتے ہیں۔

یہ ان آزمائشوں کی طرف اجمالی اشارہ ہے جو آگے کے مراحل میں مسلمانوں کو پیش آنے والی تھیں مثلاً دشمنوں کے حملہ کا اندیشہ، معاشی مشکلات اور جنگ و جہاد میں مال اور جان کی قربانی۔

یہ اللہ کی طرف تفویض و سپردگی کا کلمہ ہے کہ جب خدا ہی کے لئے ہمارا جینا اور مرنا ہے اور مرنے کے بعد اسی کی طرف ہم نے جانا ہے تو کون ہے جو ہمارے رُخ کو اس سے موڑ دے؟

شعیرہ اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی حقیقت کا احساس دلانے والی اور اس کا مظہر اور نشان ہو۔ شریعت کے وہ مظاہر جو کسی معنوی حقیقت کا شعور پیدا کرنے کے لئے مقرر کئے گئے ہیں شعائر میں شامل ہیں مثلاً قربانی، بیت اللہ، حجرِ اسود وغیرہ یہی حیثیت صفا و مروہ کی ہے جن کی سعی میں رب کے حکم کی تعمیل میں فرمانبردارانہ سرگرمی کی حقیقت مضمر ہے۔

اس حکم کے نزول کے وقت صفا و مروہ پہاڑیوں پر دو بت رکھے ہوئے تھے۔ رفعِ حرج کا تعلق اسی بات سے ہے۔ فرمایا کہ تم سعی کرو، تمہارا عمل تمہاری نیت کے مطابق ہوگا۔

کرتا ہے اور جن پر لعنت کرنے والے لعنت کریں گے[۱۹۲] ○ ۱۵۹

البتہ جن لوگوں نے توبہ کرلی اور اصلاح کرلی اور واضح طور پر بیان کر دیا تو ان کی توبہ میں قبول کروں گا۔[۱۹۳] میں بڑا توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا ہوں۔ ○ بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور اسی کفر کی حالت میں مر گئے ان پر اللہ کی، فرشتوں کی اور لوگوں کی سب کی لعنت ہے ○۔ وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے، نہ ان کا عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ ان کو مہلت ہی ملے گی ○ ۱۶۲

اور تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔[۱۹۵] وہ رحمان اور رحیم ہے ○ بیشک آسمانوں اور زمین کی خلقت، رات اور دن کی آمد و شد، اور ان کشتیوں میں جو لوگوں کے لئے سمندر میں نفع بخش سامان لے کر چلتی ہیں اور اس پانی میں جو اللہ نے بادلوں سے اتارا اور جس سے زمین کو اس کی موت کے بعد زندگی بخشی اور جس سے اس میں ہر قسم کے جاندار پھیلائے اور ہواؤں کی گردش میں اور ان بادلوں میں جو آسمان اور زمین کے درمیان مسخر ہیں، ان لوگوں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں جو عقل سے کام لیتے ہیں[۱۹۹] ○ ۱۶۴

---

۱۹۲ اشارہ یہود کے کتمانِ حق کی طرف ہے۔ لعنت اللہ تعالے کی سب سے بڑی سزا ہے جس کے نتیجہ میں ملعون قوم دنیا میں توفیقِ ہدایت سے محروم اور آخرت میں ابدی عذاب میں مبتلا کر دی جاتی ہے۔

۱۹۳ یعنی قبولیت توبہ کی شرط یہ ہے کہ حق پوشی کے جرم سے توبہ کرکے اس غلطی کی اصلاح کریں جس کے مرتکب ہو رہے ہیں اور آخری نبی سے متعلق تورات کے حقائق کو ظاہر کریں۔

۱۹۴ یہاں کفر سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنی ضد پر اڑے رہیں اور توبہ و اصلاح اور اظہار و اعلانِ حق سے محروم ہی دنیا سے اٹھ جائیں۔

۱۹۵ یہاں سے سورہ بقرہ کے مطالب کا وہ باب شروع ہو رہا ہے جس میں امت مسلمہ کے لئے از سرِ نو شریعت الٰہی کی تجدید کی گئی۔

۱۹۶ توحید کی تعلیم سب سے بڑی چیز ہے جو ملتِ ابراہیم کی وراثت کی حیثیت سے امتِ مسلمہ کی طرف منتقل ہوئی ہے۔ یہاں خدا کی وحدانیت کو مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں سے واضح فرمایا۔

۱۹۷ اختلافِ لیل و نہار سے مراد رات دن کی یکے بعد دیگرے پورے نظام اور کامل تسلسل کے ساتھ آمد و شد بھی ہے اور وہ اختلاف بھی جو ان کے مزاج، فطرت، شکل و صورت اور ان کے ظاہری و باطنی اثرات میں ہے۔

۱۹۸ بادلوں کے لئے مسخر کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جس کے معنی یہ ہیں کہ بادل خدا کے امر و حکم کے تحت بالکل مجبور و مقہور، ہر لحظہ ہر آن تعمیلِ حکم کے لئے تیار کھڑے ہیں۔

۱۹۹ اس آیت میں کائنات کے متقابل و متضاد اجزاء و عناصر کا حوالہ دیا گیا ہے اور ساتھ ہی اس حیرت انگیز

اور لوگوں میں ایسے لوگ بھی ہیں جو خدا کے ہمسر ٹھیراتے ہیں جن سے وہ اس طرح محبت کرتے ہیں جس طرح خدا سے محبت کرنی چاہیے۔ لیکن جو خدا پر ایمان رکھتے ہیں وہ سب سے زیادہ خدا سے محبت رکھنے والے ہیں۔[۲۰۰] اور اگر یہ اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے اس وقت کو دیکھ سکتے جب کہ یہ عذاب سے دوچار ہوں گے تو ان پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جاتی کہ سارا زور اور اختیار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے اور اللہ بڑا ہی سخت عذاب دینے والا ہے۔ ○ ۱۶۵

اس وقت کا خیال کرو جب کہ مقتدا اپنے پیرووں سے اظہارِ برأت کریں گے اور وہ عذاب سے دوچار ہوں گے اور ان کے تعلقات یک قلم ٹوٹ جائیں گے ○ اور ان کے پیرو بھی کہیں گے کہ اے کاش ہمیں دنیا میں ایک بار اور جانا نصیب ہوتا کہ ہم بھی ان سے اسی طرح اظہارِ برأت کر سکتے جس طرح انھوں نے ہم سے اظہارِ برأت کیا ہے![۲۰۱] اس طرح اللہ ان کے اعمال[۲۰۲] ان کو سرمایۂ حسرت بنا کر دکھائے گا اور ان کو دوزخ سے نکلنا نصیب نہ ہوگا ○ ۱۶۷

اتحاد و توافق اور ان کی بے مثال باہم آمیزی و سازگاری کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو ان کے اندر اس کائنات کی مجموعی خدمت کے لئے پائی جاتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی حکیم و مدبر ان سب پر حاکم و فرمانروا ہے۔ یہ حقیقت شرک کے تمام امکانات کا سدِ باب کرتی ہے۔

۲۰۰ محبتِ حقیقی خدا کے حقوق میں سے ہے۔ دوسروں کے لئے محبت کی مطلق نفی نہیں ہے۔ لیکن اس محبت کے لئے یہ ضروری ہے کہ یہ خدا کی محبت کے تابع ہو یعنی جہاں کہیں اور جب کبھی اس محبت اور خدا کی محبت کے تقاضوں میں ٹکراؤ ہونے لگے تو آدمی خدا کی محبت کے تقاضوں کو مقدم رکھے۔

۲۰۱ جب پیرو دیکھیں گے کہ جن کو انھوں نے خدائی کا درجہ دیا اور زندگی بھر جن کو اپنی تمام محبتوں اور نیازمندیوں کا سزاوار جانا، وہ اس سب سے مشکل وقت میں اس طرح اظہارِ بیزاری کر رہے ہیں تو وہ بھی نہایت حسرت کے انداز میں کہیں گے کہ کاش ہمیں ایک بار پھر دنیا میں جانا نصیب ہو کہ ہم بھی ان سے اظہارِ بیزاری کر سکیں۔ لیکن یہ حسرت، حسرت ہی رہے گی۔

۲۰۲ اعمال سے مراد ان کی وہ وفاداریاں اور قربانیاں ہیں جو ان مشرکین نے اپنے باطل معبودوں یا اپنے ان گمراہ کرنے والے سرداروں اور لیڈروں کیلئے کی ہوں گی۔

امین احسن اصلاحی

فہم قرآن کے چند بنیادی اصول (۵)

قرآن قطعی الدلالۃ ہے:

فہم قرآن کے لئے ایک اور اصول جس کو ماننا ضروری ہے، یہ ہے کہ قرآن قطعی الدلالۃ ہے: یعنی قرآن مجید کے الفاظ کے لغوی معانی ان کے مفہوم کی طرف ٹھیک ٹھیک رہنمائی کرتے ہیں۔ یہ بات نہیں ہے کہ قرآن مجید نے جو لفظ استعمال کیا ہو وہ اگرچہ ایک خاص معنی دے رہا ہو لیکن قرآن اس کو نظر انداز کرکے مراد اس سے مختلف لے رہا ہو۔ یا قرآن کا بیان بادی النظر میں تو ہر قاری کو کچھ معلوم ہوتا ہو، لیکن اصل میں قرآن کا مفہوم اس سے مختلف ہو جو ہر پڑھنے والا اس سے سمجھتا ہے۔ اس بحث کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ کچھ غلط فہمیاں لوگوں کے ذہنوں میں اس قدر رچ بس گئی ہیں کہ ان کے مضمرات کی طرف عام طور پر نگاہ نہیں جاتی لیکن اس کے نتیجہ میں قرآن کی حیثیت مجروح ہوتی ہے اور یہ چیز فہم قرآن میں بڑی رکاوٹ پیدا کرتی ہے۔ اس نوعیت کی بعض غلط فہمیاں یہ ہیں:-

۱۔ بعض متکلمین کا نظریہ یہ ہے کہ الفاظ قرآن کی دلالت اپنے معانی پر ظنی ہے جب کہ ان کے زعم میں کلامی مسائل کی بنیاد براہنیات پر ہے جو قطعی ہیں۔

۲۔ قرآن مجید چونکہ محکمات اور متشابہات کا مجموعہ ہے اور ان دونوں اقسام کی آیات متعین نہیں ہیں۔ اس لئے پورے قرآن کی دلالت ان کے خیال میں ظنی ہو گئی۔

۳۔ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف قرآن کے علاوہ بھی وحی ہوتی ہے جو اگرچہ تحریر میں نہیں آئی اور اس طرح وہ غیر متلو ہے لیکن وہ بھی اسی طرح ہدایت کا ماخذ ہے جس طرح قرآن۔ لہٰذا متن قرآن کی دلالت قطعی نہیں رہی۔ ممکن ہے اس کے مفہوم کو کسی غیر متلو وحی نے بدل دیا ہو۔

۴۔ قرآن مجید کی متداول قرآتیں سات یا اس سے بھی زیادہ ہیں اس لئے کسی ایک قرأت کی دلالت قطعی نہیں ہو سکتی۔

ان غلط فہمیوں کی وجہ سے فتنوں کا دروازہ کھل گیا ہے اور قرآن فہمی کی راہ مسدود ہو گئی ہے۔ ضرورت ہے کہ ان غلط فہمیوں کو دور کیا جائے تاکہ فتنوں کا سدباب ہو سکے۔

کیا الفاظ کی دلالت ظنی ہے؟

مسلمانوں کا تعلق جب عجمی قوموں سے ہوا اور ان کے علوم و فنون سے ان کو واسطہ پڑا تو دینی مسائل پر سوچنے کا وہ انداز فکر وجود میں آیا جس کو علمِ کلام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ اس علم نے مسلمانوں کے اندر مختلف مکتب خیال پیدا کئے اور ان میں سے ہر مکتبِ خیال کے لوگوں نے اپنے مخصوص افکار و نظریات کے مطابق قرآنِ مجید کی تفسیریں لکھیں اور اپنے مزعومات کو قرآن مجید کی صریح آیات پر فوقیت دینے کی کوشش کی۔ اس کی بے شمار مثالیں ہم کو امام رازیؒ کی تفسیر میں مل سکتی ہیں۔ وہ بسا اوقات اشاعرہ کے کلامی نظریات کو صحیح ثابت کرنے کے لئے حدودِ تفسیر سے اس قدر تجاوز کر جاتے ہیں کہ اگر کوئی آیت ان کو صریحاً مسلکِ اشاعرہ کے خلاف نظر آتی ہے تو اس کی تردید میں وہ یہ کہہ جانے میں بھی کوئی باک نہیں محسوس کرتے کہ الفاظِ قرآن کی دلالت اپنے معانی پر ظنی ہے تو کلامی براہنیات کے مقابلے میں ایک ظنی چیز کو کیا اہمیت دی جا سکتی ہے۔ امام رازیؒ کے اپنے الفاظ ملاحظہ ہوں:-

الدلائل اللفظية لا تكون قاطعة البتة	لفظی دلائل ہرگز قطعی نہیں ہو سکتے کیونکہ ہر دلیلِ لفظی
لان كل دليل لفظي فانه موقوف على نقل اللغات	لغات اور وجوہِ اعراب کے نقل اور عدمِ اشتراک، عدمِ
ونقل وجوه النحو والتصريف وموقوف	مجاز، عدمِ تخصیص، عدمِ اضمار اور عدمِ معارضِ عقلی و نقلی پر
على عدم الاشتراك وعدم المجاز وعدم التخصيص	مبنی ہے اور ان میں سے ہر چیز ظنی ہے اور جو چیز کسی
وعدم الاضمار وعدم المعارض النقلي والعقلي	ظنی چیز پر موقوف ہے وہ بدرجہ اولیٰ ظنی ہے۔ اس سے
وكل ذلك مظنون والموقوف على المظنون	ثابت ہوا کہ لفظی دلائل ہرگز قطعی نہیں ہو سکتے۔

اولیٰ ان يكون مظنونا فثبت ان شيئا من الدلائل اللفظية لا يكون قاطعاً۔

اس طرح کی باتیں لکھنے کی ضرورت امام رازیؒ کو اس لئے پیش آئی کہ انہیں کچھ الفاظ کے معانی اپنی براہنیات سے متصادم نظر آئے۔ اس پر انھوں نے یہ اصول گھڑ لیا کہ الفاظ کی دلالت ان کے معانی پر ظنی ہے اور ظنی اور کمزور دلائل کی بنا پر کچھ کہنا جائز نہیں۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:-

فاذا كانت المسئلة قطعية يقينية	جب کہ ایک مسئلہ اپنی جگہ پر قطعی اور یقینی ہو تو اس کے
كان القول فيه بالدلائل الظنية	بارے میں ظنی اور کمزور دلائل کی بنا پر کچھ کہنا ناجائز ہے مثلاً
الضعيفة غير جائز مثاله قال الله تعالیٰ	لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا (اللہ تعالیٰ کسی جان
لا يكلف الله نفسا الا وسعها۔ قام	پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا) کے متعلق

الدليل القاطع على ان مثل هذا	قطعی دلائل سے ثابت ہو چکا ہے کہ اس قسم کی تکلیف
التكليف قد وجد على ما بينا بالبراهين	مالا یطاق اللہ تعالے اپنے بندوں کو دیتا ہے۔ ہم اس
الخمسة فى تفسير هذه الآية	آیت کی تفسیر کے ذیل میں اس کی تائید میں پانچ نہایت
فعلمنا ان مراد الله تعالے	محکم دلیلیں لکھ چکے ہیں۔ پس ظاہر ہے کہ اس سے اللہ
ليس ما يدل عليه ظاهر	تعالے کی مراد وہ نہیں ہو سکتی جو ظاہر آیت سے
هذه الآية	معلوم ہوتی ہے۔

الفاظ قرآن کی دلالت کو ظنی قرار دینے کی دوسری وجہ یہ بھی ہوئی کہ چند نادر الفاظ کے معنی متعین کرنے میں کچھ اختلاف ہوا جس کو اہل تاویل رفع نہ کر سکے۔ مثلاً لفظ "قروء" کے معنی ایک گروہ کے نزدیک "طہر" کے ہیں اور دوسرے کے نزدیک "حیض" کے۔ ہر گروہ کے پاس اپنے اپنے دلائل ہیں۔ اس اختلاف سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ اس لفظ کی دلالت اپنے معنی پر قطعی نہیں بلکہ ظنی ہے۔ اس طرح کے اختلافات کی بنا پر بعض لوگوں نے وضع کر دیا کہ قرآن مجید کے الفاظ کی دلالت اپنے معانی پر ظنی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک بدترین قسم کی سوفسطائیت ہے۔ انسان کی آنکھ اگر کبھی دھوکا کھا جاتی ہے تو اس سے یہ اصول نہیں بنایا جا سکتا کہ آنکھ دھوکا دینے ہی کے لئے بنی ہے۔ عقل انسان کو سوچنے کے لئے دی گئی ہے اس کے کبھی کبھار ٹھوکر کھا جانے کے معنی یہ ہرگز نہیں کہ وہ ٹھوکر کھلانے کے لئے دی گئی ہے۔ اسی طرح کسی لفظ کے معنی میں اختلاف تو ہو سکتا ہے لیکن اس اختلاف کی وجہ سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ زبان کے سارے الفاظ کی دلالت اپنے معانی پر ظنی ہے۔

بعض الفاظ کے معانی میں اختلاف ہر زبان میں ہوتا ہے۔ یہ اختلافات طے کرنے کے لئے اصول بنے ہوتے ہیں۔ اہل زبان ان اصولوں کی روشنی میں یہ اختلاف طے کر لیتے ہیں۔ مثلاً اردو کے کسی لفظ کے معنی میں اختلاف ہو گا تو ہم یہ دیکھیں گے کہ دلی کی زبان میں یہ لفظ کس معنی میں بولا گیا، غالب یا داغ نے اس کو کس مفہوم میں استعمال کیا اور اگر دلی اور لکھنؤ کا اختلاف ہو گا تو دیکھیں گے کہ دلی میں کس معنی میں استعمال ہوتا ہے اور لکھنؤ کے معتبر ادیبوں کے ہاں وہ کس معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اس طرح سے لفظ کے صحیح معنی متعین ہو جاتے ہیں۔ علی ہذا القیاس اگر ہمیں عربی کے کسی لفظ کے بارے میں مشکل پیش آتی ہے تو ہم "لسان العرب" دیکھتے ہیں۔ اگر اس میں اہل لغت مختلف ہوتے ہیں تو اس کے شواہد پر نظر ڈالتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ قریش کی ٹکسالی زبان میں اس کا کیا مفہوم ہے۔ امرؤ القیس نے اسے کیسے استعمال کیا ہے۔ زہیر نے کیا معنی لئے ہیں۔ دوسرے مستند شعراء کے ہاں وہ کس طرح استعمال ہوا ہے؟

پھر جس معنی کی تائید میں دلائل پاتے ہیں اس کو ترجیح دیتے ہیں اور اگر قرآن مجید میں اس کی نظیر مل جائے تب تو کسی اور دلیل کی حاجت ہی نہیں رہتی کیونکہ اس سے بڑی کوئی دلیل نہیں۔ قرآن اعلیٰ عربی ادب کا سب سے مستند ماخذ ہے۔

کوئی زبان ایسی نہیں ہو سکتی جس کے الفاظ کی دلالت اس کے معانی پر ظنی ہو۔ اگر زبان کی دلالت غیر معتمد قرار دے دی جاتے تو اس کے معنی یہ ہوتے کہ اس زبان میں ساری دستاویزیں اور سارے قوانین و معاہدات بالکل بے معنی ہیں۔ قرآن مجید اللہ تعالے کی طرف سے اس کے بندوں کی طرف کتاب مبین کی شکل میں ایک صحیفۂ رشد و ہدایت بن کر نازل ہوا ہے۔ اس کے متعلق یہ کیونکر باور کیا جا سکتا ہے کہ اس کے الفاظ کی دلالت اس کے معانی پر ظنی ہے۔ ان لوگوں کی عقلوں پر افسوس ہے جنہوں نے یہ سنگین بات کہی اور اس کے نتائج پر انھوں نے غور نہیں کیا۔

محکمات اور متشابہات واضح ہیں:

متکلمین نے قرآن مجید کی آیۃ "هُوَ الَّذِىٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ......" سے یہ استدلال کیا ہے کہ قرآن مجید میں چونکہ محکمات اور متشابہات دونوں ہیں اور متشابہات کا علم صرف اللہ تعالیٰ ہی کے پاس ہے تو یہ کیسے معلوم ہو کہ کون سی آیت محکم اور کون سی متشابہ ہے؟ پھر ایک قدم اور آگے بڑھ کر انھوں نے یہ نتیجہ نکال لیا کہ جب محکم و متشابہ متعین نہیں ہیں تو دوسرے لفظوں میں اس کے معنی یہ ہوئے کہ پورا قرآن غیر محکم ہے۔ یہ محکم اور متشابہ کا فتنہ کوئی معمولی فتنہ نہیں ہے۔ مسلمانوں میں جب کلامی و فقہی بحثوں کا زور ہوا تو ہر فرقہ اس حربہ کو اپنے حریف کے مقابل میں استعمال کیا اور ہر اس آیت کو اس نے متشابہ قرار دے دیا جو اس کو اپنے مدعا کے خلاف اور حریف کے مقصد کے موافق نظر آئی۔ حالانکہ قرآن مجید میں محکم اور متشابہ دونوں واضح ہیں۔ آیات محکمات سے مراد قرآن مجید کی وہ آیات ہیں جو آفاق و انفس کی بدیہیات، خیر و شر کے مسلمات اور معروف و منکر کے قطعیات اور یقینیات پر مشتمل ہیں جن کو دل قبول کرتے ہیں اور جن کو قبول کرنے کے لئے اس کے سوا کوئی شرط نہیں ہے کہ دل سلیم ہو۔ جن کے حق ہونے پر عقل گواہی دیتی ہے بشرطیکہ اس پر متعصب جذبات اور غیر فطری عقلیات کے پردے نہ پڑے ہوں۔ یہی آیات ہیں جن کی حیثیت ام الکتاب کی ہے یعنی بقیہ ساری کتاب کا مرجع و مرکز وہی محکمات ہیں۔ انہیں پر ساری بحث کا مدار ہوتا ہے۔ ساری شاخیں انہی سے پھوٹتی ہیں۔ اگر کوئی نزاع و اختلاف پیدا ہو تو اس کا فیصلہ بھی انہی کی

کسوٹی پر پرکھ کر ہوتا ہے۔ انہی کو اصول قرار دے کر ان سے مسائل مستنبط ہوتے ہیں۔ ان کے مقابل میں متشابہات سے مراد وہ آیتیں ہیں جن میں ہمارے مشاہدات و معلومات کے دسترس سے باہر کی کچھ بات تمثیل اور تشبیہی رنگ میں قرآن نے بتائی ہیں۔ یہ باتیں جس بنیادی حقیقت سے تعلق رکھنے والی ہوتی ہیں وہ بجائے خود واضح اور مبرہن ہوتی ہے۔ عقل اس کے اتنے حصے کو سمجھ سکتی ہے جتنا سمجھنا اس کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ البتہ چونکہ ان کا تعلق ایک نادیدہ عالم سے ہوتا ہے اس وجہ سے قرآن ان کو تمثیل و تشبیہ کے انداز میں پیش کرتا ہے تاکہ علم کے طالب بقدر استعداد ان سے فائدہ اٹھالیں اور اصل صورت و حقیقت کو علم الٰہی کے حوالہ کریں۔ ان کا تعلق عقائد و شرائع سے یا اللہ تعالٰی کے قوانین و سنن سے یا مسلمات فطرت اور مسلمات عقل سے نہیں ہوتا بلکہ محض جنت اور دوزخ کے بعض احوال اور لذات و آلام سے ہوتا ہے۔ ان کا جس حد تک سمجھنا ضروری ہے اتنا ہماری سمجھ میں آجاتا ہے۔ اور اس سے ہمارے علم و یقین میں اضافہ ہوتا ہے۔ اور اگر ان کا کوئی پہلو سمجھ میں نہیں آتا تو اس کے نہ سمجھنے سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا۔

متشابہات کا دائرہ زیادہ وسیع نہیں بلکہ بہت محدود ہے۔ مثلاً جن چیزوں کو قرآن مجید نے متشابہ کہا ہے ان کو ایک مثال سے سمجھئے۔ دوزخ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے "علیها تسعة عشر" (اس کے اوپر انیس سرہنگ مقرر ہیں) یا مثلاً دوزخ کے شجر معلونہ (زقوم) کو متشابہ کہا ہے۔ یہ قیامت کی جزئیات میں سے بعض ایسی باتیں ہیں جو ہمیں سمجھانے کے لئے ہماری زبان میں بتائی گئی ہیں۔ ان کی اصل حقیقت کیا ہے، یہ چیز ہم یہاں نہیں جان سکتے ان کی حقیقت صرف اللہ ہی جانتا ہے۔ جہاں تک قیامت کا معاملہ ہے وہ متشابہ نہیں۔ البتہ اس کی تفصیلات میں سے بعض جزئی چیزیں ہیں جنہیں متشابہات کہا گیا ہے۔ ان کی حقیقت اگر آپ کو معلوم نہ ہو تو اس سے قیامت کے عقیدہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ فرض کیا کہ سمجھ میں نہیں آیا کہ جو انیس سرہنگ ہوں گے وہ کس قوت و طاقت کے مالک ہوں گے؟ ان کی شکل و صورت کیا ہوگی یا وہ کون سا لباس پہنیں گے۔ تو کیا ان جزئیات کے نہ سمجھنے سے جزا و سزا کا معاملہ مشتبہ ہو جائے گا؟ اساسات دین سے ان کا کیا تعلق! اور یہ کون سی عقلمندی کی بات ہوگی کہ آدمی چند جزئی باتوں کے نہ سمجھ سکنے کے سبب سے اپنے اس سارے ذخیرۂ علم کو اٹھا پھینکے جو اس کے نزدیک ثابت شدہ ہے اور جس پر اس کی عقل اور فطرت گواہ ہے۔

وحی متلو اور وحی غیر متلو ہم پلہ نہیں ہیں:

اصولیین یعنی اہل فقہ کہتے ہیں کہ وحی صرف اتنی ہی نہیں جتنی قرآن میں ہے بلکہ ان کے علاوہ بھی آنحضرت

صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوتی ہے جس کو وحی غیر متلو کہتے ہیں۔ اس سے بعض کم فہم لوگ یہ نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ چونکہ وحی متلو اور غیر متلو میں امتیاز مشکل ہے۔ اس وجہ سے یہ چیز قرآن کی قطعیت میں قادح ہے۔ لیکن یہ خیال محض جہالت پر مبنی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن مجید کے علاوہ بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہوتی جس کو وحی غیر متلو کہتے ہیں لیکن اس وحی کا قرآن مجید سے کوئی تعلق نہیں۔ قرآن سے تعلق صرف وحی متلو کو ہے جس کی تلاوت، تذکیر اور حفاظت و صیانت پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم مامور تھے۔ اسی کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی تھی اور جب یہ دعا پوری ہوئی تو اللہ تعالٰی نے عربوں پر اس کا احسان جتایا۔

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا	وہی ہے جس نے امیوں میں انہی میں سے ایک
مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ	رسول بھیجا جو ان پر اس کی آیتیں پڑھتا ہے ان کا تزکیہ
وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ... (جمعہ - ۲)	کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی منصبی ذمہ داری تھی کہ آپ اس وحی کی تبلیغ میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں۔ آپ کو تنبیہ کی گئی کہ اگر آپ نے اس تبلیغ میں کوئی کسر اٹھا رکھی تو گویا فرض رسالت ادا نہیں کیا۔ فرمایا

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنزِلَ إِلَيْكَ	اے رسول! تمہاری طرف جو چیز تمہارے رب کی
مِن رَّبِّكَ ۖ وَإِن لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ	جانب سے اتاری گئی ہے اس کو اچھی طرح پہنچا دو۔ اگر تم نے
رِسَالَتَهُ ۚ وَاللَّهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۗ	ایسا نہ کیا تو تم نے اس کے پیغام کو نہیں پہنچایا اور اللہ لوگوں سے
إِنَّ اللَّهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ (المائدہ - ۶۷)	تمہاری حفاظت کرے گا۔ اللہ کافروں کو ہرگز راہ یاب نہیں کرے گا۔

اس وحی کی تبلیغ ہی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن کا اصل کام تھا۔ چنانچہ حجۃ الوداع کے موقع پر آپ نے لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ "اے لوگو! گواہ رہو کہ میں نے اپنے رب کا پیغام پہنچا دیا۔" اس وحی کے حرف حرف کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح سنایا جیسا اس کے سنانے کا حق تھا۔ اس کو حضور نے اپنی نگرانی میں مدون بھی کرا دیا اور یہ بعینہ بین الدفتین بسم اللہ سے لے کر والناس تک قرآن مجید کی صورت میں محفوظ ہے اور امت مسلمہ اس کی امین بنائی گئی ہے۔

قرآن مجید کے علاوہ جو وحی غیر متلو ہے اس کی تفصیل سے ہم آگاہ نہیں کئے گئے۔ اس وجہ سے ہم پر اس کی ذمہ داری بھی نہیں ڈالی گئی۔ اگر کوئی قول اس سلسلہ میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب کیا جائے گا تو ہم اس کی تحقیق کریں گے، اس کو روایت کے اصولوں پر جانچیں گے، درایت کے اصولوں پر پرکھیں گے۔ قرآن سے اس کی مطابقت اور مخالفت دیکھیں گے۔ ان تمام کسوٹیوں پر پرکھنے

کے بعد جب اطمینان ہو جائے گا تب اس کو وہ درجہ دیں گے جو دین میں اس کا ہوگا۔

وحی متلو وہی ہے جو قرآن مجید کی صورت میں محفوظ ہے۔ اس کے علاوہ وحی متلو ایک حرف بھی نہیں ہے۔ اس میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں جس کے بارے میں ہمیں کسی قسم کا تردد ہو۔ اس کا ایک ایک حرف محفوظ ہے اور اس کا کوئی نقطہ غائب نہیں۔ اس کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالٰی نے لیا ہے۔ "اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ" (اور ہمارے ذمہ ہے اس کو جمع کرنا اور اس کو سنانا)۔

قرأتوں کا اختلاف :

بعض لوگ قرآن کی قرأتوں کو بھی قرآن کی دلالت کے قطعی ہونے میں قادح سمجھتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اس اختلافِ قرارت کے مسئلہ پر بھی لوگوں نے صحیح نہج سے غور نہیں کیا۔ اس وجہ سے غلط فہمیاں پیدا ہوئیں۔ عام طور پر مشہور ہے کہ قرآن مجید کی سات قرأتیں ہیں۔ یہ غلط فہمی غالباً اس حدیث سے پیدا ہوئی جو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے مروی ہے کہ "انزل القرآن علی سبعۃ احرف" (قرآن سات حرفوں پر اتارا گیا) سات حرفوں کے معنی اگر یہ لئے جائیں کہ قرآن کے تمام الفاظ سات طریقوں سے پڑھے جا سکتے ہیں تو اس صورت میں قرآن ایک معمہ بن کر رہ جائے گا۔ لیکن جو لوگ قرأتوں کے اختلاف کو بڑی اہمیت دیتے ہیں وہ بھی یہ دعوٰی نہیں کر سکتے کہ قرآن کے کسی لفظ کی قرأت سات طریقوں سے کی گئی ہے۔ ابن جریرؒ قرأتوں کے اختلاف نقل کرنے میں بڑے فیاض واقع ہوئے ہیں۔ لیکن انھوں نے بھی کسی لفظ کی دو تین سے زیادہ قرأتیں شاید ہی نقل کی ہوں۔

"سبعۃ احرف" سے کیا مراد ہے۔ اس میں علمائے فن کا اختلاف ہے۔ اس کے متعلق چالیس سے زیادہ قول ہیں جن میں سے ایک قول یہ بھی ہے کہ یہ متشابہات میں سے ہے۔ علامہ سیوطیؒ نے اسی قول کو ترجیح دی ہے۔ اس قدر اختلاف کی موجودگی میں "سبعۃ احرف" سے سات قرأتیں مراد لینا اور اس پر اصرار کرنا کس طرح جائز ہو سکتا ہے؟ پھر یہ بات بھی یاد رکھئے کہ بعض علماء سات کے عدد کو متعین سات کے معنی میں نہیں بلکہ کثرت کے مفہوم میں لیتے ہیں۔ اس لئے کہ ان کے نزدیک قرأتیں دراصل بیس ہیں۔

غور کرنے سے یہ بات بھی سامنے آتی ہے کہ قرأتوں کا اختلاف دراصل قرأتوں کا اختلاف نہیں۔ بلکہ اکثر و بیشتر تاویل کا اختلاف ہے کسی صاحب تاویل نے ایک لفظ کی تاویل کسی دوسرے لفظ سے کی اور اس کو قرأت کا اختلاف سمجھ لیا گیا حالانکہ وہ قرأتوں کا اختلاف نہیں بلکہ تاویل کا اختلاف

ہے۔ مثلاً سورہ تحریم میں بعض لوگوں نے "فَقَدْ صَغَتْ" کو "فَقَدْ زَاغَتْ" بھی پڑھا۔ صاف معلوم ہوتا ہے کہ جس نے بھی یہ پڑھا ہے اس نے یہ قرأت نہیں بتائی، بلکہ اپنے نزدیک اس نے "فقد صغت" کی تاویل کی ہے لیکن لوگوں نے اس کو بھی قرأت سمجھ لیا۔

ہمارے نزدیک قرأتوں کے اختلاف کو خلیفہ راشد سیدنا عثمان غنیؓ نے ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا تھا اور انھوں نے یہ عظیم کارنامہ تمام صحابہؓ کے اتفاق رائے سے انجام دیا۔ اس وجہ سے اس کو اجماع کی حیثیت حاصل ہے۔ اس کے بعد اس کے باقی رہنے کے لئے کوئی جواز نہیں ہے۔

سیدنا عثمانؓ کے دورِ خلافت میں جب یہ معلوم ہوا کہ مملکت کے بعض شہروں میں قرآن کے بعض الفاظ کی قرأت مختلف طریقوں سے ہوتی ہے تو آپؓ نے قرآن کے تمام اصحابِ علم صحابہ کرام کو جمع کر کے ان کے سامنے تمام مختلف فیہ الفاظ کو رکھا اور ایک ایک پر بحث کر کے اتفاق رائے سے لوگوں کو اس قرارت پر جمع کر دیا جو قریش کی قرأت تھی اس لئے کہ یہ بات نصِ قرآن سے ثابت ہے کہ قرآن قریش کی ٹکسالی زبان میں نازل ہوا ہے۔ پھر اس قرأت کے مطابق قرآن کے نسخے لکھوا کر مختلف شہروں میں بھجوا دیئے گئے کہ لوگ اس قرأت کی پیروی کریں۔ ہمارے ہاتھوں میں جو مصحف ہے وہ اسی قرأت پر ہے۔ اس قرأت کو قرأتِ حفص کہتے ہیں متواتر قرأت صرف یہی ہے۔ جس پر خلیفہ راشدؓ کی قیادت میں امت کا اجماع ہوا ہے۔ اس کے مقابل میں دوسری قرأتوں کی حیثیت شاذ قرأتوں کی ہے۔ جس کی متواتر قرأت کے مقابل میں کوئی اہمیت باقی نہیں رہتی۔

(ترتیب : عبداللہ غلام احمد)

بقیہ : **تصوّف اسلام کے متوازی ایک دین ہے**

چیز نہیں ہو سکتی تو تصوف کو پرکھے بغیر کیسے مانا جا سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص تصوف کا دلدادہ ہے تو بے شک وہ اپنا شوق پورا کرے ہم اس کو نہیں روکتے لیکن تصوف کی کوئی بات قرآن پر جانچے بغیر اس نے قبول کر لی تو عنداللہ وہ پکڑا جائے گا۔

(ترتیب : بشیر احمد)

تدبر حدیث

خالد مسعود

فرائض دین کی پابندی کا صلہ

عن أنس بن مالك قال نهينا ان نسأل رسول الله صلى الله عليه وسلم عن شئ فكان يعجبنا ان يجيئ الرجل من اهل البادية العاقل فيسأله ونحن نسمع فجاء رجل من اهل البادية فقال يا محمد اتانا رسولك فزعم لنا انك تزعم ان الله ارسلك قال صدق قال فمن خلق السماء قال الله، قال فمن خلق الارض قال الله، قال فمن نصب هذا الجبال وجعل فيها ما جعل قال الله قال فبالذى خلق السماء وخلق الارض ونصب الجبال آلله ارسلك قال نعم قال وزعم رسولك ان علينا خمس صلوات فى يومنا وليلتنا قال صدق، قال فبالذى ارسلك آلله امرك بهذا قال نعم. قال وزعم رسولك ان علينا زكاة فى اموالنا قال صدق قال فبالذى ارسلك آلله امرك بهذا قال نعم، قال وزعم رسولك ان علينا صوم شهر رمضان فى سنتنا قال صدق فبالذى ارسلك آلله امرك بهذا قال نعم قال وزعم رسولك ان علينا حج البيت من استطاع اليه سبيلا قال صدق قال ثم ولى قال والذى بعثك بالحق لا ازيد عليهن و لا انقص منهن قال النبى صلى الله عليه وسلم لئن صدق ليدخلن الجنة۔ (مسلم۔ باب السوال عن اركان الاسلام)

ترجمہ:۔ انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ پوچھنے سے روک دیا گیا تو ہمیں اس بات سے بڑی خوشی ہوتی تھی کہ کوئی عقلمند بدو آکر آپ سے سوال کرے جبکہ ہم سن رہے ہوں۔ چنانچہ ایک بدو شخص آیا اور کہنے لگا: اے محمد! ہمارے پاس آپ کا

قاصد آیا اور یہ بیان کیا کہ آپ کا دعویٰ یہ ہے کہ اللہ نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا ہے'، آپ نے فرمایا: اُس نے سچ کہا'، بدو نے کہا: 'تب یہ بتائیے کہ آسمان کس نے بنایا'؟ آپ نے فرمایا: 'اللہ نے'۔ اس نے پوچھا: 'زمین کس نے بنائی'؟ آپ نے فرمایا: 'اللہ نے'۔ اس نے سوال کیا: 'کس نے یہ پہاڑ گاڑ دیے اور ان کے اندر طرح طرح کی چیزیں رکھ دیں'؟ آپ نے فرمایا: 'اللہ نے'۔ اس نے کہا: 'اس ذات کی قسم جس نے آسمان بنایا، زمین بنائی اور پہاڑ نصب کئے، بتائیے کیا واقعی اللہ نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا؟' آپ نے فرمایا: 'ہاں'۔ اس نے کہا: 'آپ کے قاصد کا کہنا یہ ہے کہ ہمارے اوپر ایک دن رات میں پانچ نمازیں فرض ہیں'؟ آپ نے فرمایا: 'اس نے ٹھیک بتایا'۔ اس نے پوچھا: 'اس ذات کی قسم جس نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا کیا واقعی اللہ نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے'؟ آپ نے فرمایا: 'ہاں'۔ اس نے کہا: 'آپ کے قاصد نے یہ بھی بتایا ہے کہ ہمارے مالوں میں ہمارے اوپر زکوٰۃ واجب ہے'۔ آپ نے فرمایا: 'اس کا کہنا درست ہے'۔ اس نے پوچھا: 'اس ذات کی قسم جس نے آپ کو رسول بنا کر بھیجا کیا واقعی اللہ نے آپ کو اس کا حکم دیا'؟ آپ نے جواب دیا: 'ہاں'۔ اس نے کہا: 'آپ کے قاصد نے ہمارے ذمہ سال میں ماہِ رمضان کے روزے واجب بتائے ہیں'؟ آپ نے فرمایا: 'اس نے ٹھیک بتایا'۔ اس نے کہا: 'اس ذات کی قسم جس نے آپ کو رسول بنایا کیا واقعی اللہ نے آپ کو اس کا حکم دیا'؟ آپ نے فرمایا: 'ہاں'۔ اس نے کہا: 'اور آپ کے قاصد نے یہ بھی بتایا کہ ہم میں سے ہر شخص پر جو سفر کی استطاعت رکھتا ہو، بیت اللہ کا حج فرض ہے'؟ آپ نے فرمایا: 'اس نے سچ کہا ہے'۔ انسؓ کہتے ہیں کہ اس پر وہ شخص مڑا اور کہا: 'اس ذات کی قسم جس نے آپ کو حق کے ساتھ مبعوث کیا، میں ان احکام پر نہ اضافہ کروں گا اور نہ ان میں کمی کروں گا'۔ اس پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: 'یہ شخص سچا ثابت ہوا تو جنت میں ضرور داخل ہوگا'۔

روایت کے دوسرے طرق:

امام بخاریؒ کتاب العلم میں ایک روایت لاتے ہیں جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے:

"انس بن مالکؓ بیان کرتے ہیں کہ اس دوران کہ ہم مسجد نبوی میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بیٹھے تھے، ایک آدمی اونٹ پر سوار مسجد میں داخل ہوا۔ اس نے اونٹ کو مسجد میں بٹھا کر اس کا گھٹنا باندھ دیا پھر لوگوں سے پوچھا "تم میں محمد کون ہیں؟" اس وقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے درمیان ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ ہم نے اسے بتایا کہ ٹیک لگاتے ہوئے یہ سرخ و سپید شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس آدمی نے کہا: "اے عبد المطلب کے بیٹے!" نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "میں تمہاری طرف متوجہ ہوں"۔ اس نے کہا "میں آپ سے کچھ سوال کروں گا اور اس میں ذرا سخت کلامی کروں گا لیکن اس کو برا نہ ماننا"۔ آپ نے فرمایا "جو تمہارے جی میں آئے پوچھو"۔ اس نے کہا "میں آپ کے رب اور آپ سے پہلے کے تمام لوگوں کے رب کی قسم لے کر پوچھتا ہوں کیا: واقعی اللہ نے آپ کو تمام لوگوں کی طرف رسول بنایا؟" آپ نے فرمایا "ہاں خدا گواہ ہے"۔ اس نے کہا "میں اللہ کی قسم لے کر آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا واقعی اس نے آپ کو حکم دیا کہ ہم رات دن میں پانچ نمازیں ادا کریں؟" آپ نے فرمایا "ہاں خدا گواہ ہے"۔ اس نے پوچھا "میں اللہ کا واسطہ دے کر آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا واقعی اللہ نے آپ کو حکم دیا کہ ہم سال میں اس ماہ (رمضان) کے روزے رکھیں؟" آپ نے فرمایا "ہاں! خدا گواہ ہے"۔ اس نے کہا "میں اللہ کی قسم لے کر آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا واقعی اللہ نے آپ کو حکم دیا کہ یہ صدقہ ہمارے امیروں سے وصول کرو اور ہمارے غریبوں میں اسے تقسیم کرو؟" نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "ہاں خدا گواہ ہے"۔ اس آدمی نے کہا "آپ جو پیغام لے کر آئے ہیں اس پر ایمان لایا ہیں اپنی قوم کا قاصد ہوں جو پیچھے آیا چاہتی ہے۔ میں بنی سعد بن بکر کا فرد ضمام بن ثعلبہ ہوں"۔

(بخاری - باب ماجاء فی العلم)

اس روایت اور مذکورہ صدر روایت میں اتنی مشابہت ہے کہ ذہن یہ تسلیم کرتا ہے کہ راوی نے ایک ہی واقعہ کو مختلف الفاظ میں بیان کیا ہے۔ موخرالذکر روایت میں بدو کے آنے، سواری بٹھانے اور حضورؐ کا تعارف حاصل کرنے کا اضافی بیان ہے جبکہ مسلم کی روایت میں یہ تفصیل بیان نہیں ہوئی۔ لیکن مسلم کی روایت میں کائنات کے شواہد سے ذاتِ خداوندی کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نقطۂ نظر جو دریافت کیا گیا ہے اس کا تذکرہ بخاری کی روایت میں نہیں ہے۔ بخاری کی روایت

کے مطابق آخر میں بدو نے اپنا تعارف کرایا لیکن اس کا یہ عزم بیان نہیں ہوا کہ میں ان احکام میں کوئی کمی یا بیشی نہ کروں گا۔

جب دو حدیثیں اس قدر مماثل ہوں اور دونوں میں بعض اضافی بیانات موجود ہوں تو ان کو جمع کرنا فہم حدیث کے لئے مفید ہوتا ہے جب تک قرآن سے یہ ثابت نہ ہو جائے کہ یہ دونوں بالکل مختلف مواقع سے متعلق ہیں۔ یہاں اس بات کی کوئی واضح دلیل موجود نہیں کہ یہ دو مختلف واقعات کا بیان ہے۔ لہذا دونوں روایتوں کو جمع کرنے سے یہ ضمام بن ثعلبہ کا واقعہ قرار پائے گا کہ وہ اپنی قوم کے وفد سے پہلے مدینہ پہنچے۔ مسجد میں جا کر پہلے حضور سے تعارف حاصل کیا پھر دوٹوک انداز میں بات کرنے کی اجازت چاہی۔ اجازت ملنے پر آسمان، زمین، پہاڑوں اور انسانوں کی تخلیق کا حوالہ دیا اور ان کے پیدا کرنے والے کے متعلق حضورؐ کی رائے دریافت کی۔ جب یقین ہو گیا کہ حضور اللہ ہی کو اپنا رب مانتے ہیں تب حضورؐ سے حلف لے کر پوچھا کہ کیا فی الواقع آپ خدا کے رسول ہیں اور نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے جو احکام دے رہے ہیں کیا وہ واقعی اللہ تعالےٰ کی منشا کے مطابق ہیں۔ جب ضمام نے بقیدِ قسم حضورؐ سے جوابات لے لئے تب اپنا تعارف کرایا اور ان احکام پر عملدرآمد کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر واضح کیا۔ جس پر حضورؐ نے فرمایا کہ اگر یہ شخص سچا اور پکا ثابت ہوا تو فلاح پائے گا۔

امام مسلم نے اس سے ملتی جلتی ایک اور روایت بھی بیان کی ہے جو طلحہ بن عبید اللہ سے وارد ہوئی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

جاء رجل الى رسول الله صلى الله عليه وسلم من اهل نجد ثائر الرأس نسمع دوى صوته ولا نفقه ما يقول حتى دنا من رسول الله صلى الله عليه وسلم فاذا هو يسأل عن الاسلام فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم خمس صلوات فى اليوم والليلة فقال هل على غيرهن قال لا الا ان تطوع وصيام شهر رمضان فقال هل على غيره فقال لا الا ان تطوع وذكر له رسول الله صلى الله عليه وسلم الزكاة فقال هل على غيرها قال لا الا ان تطوع قال فادبر الرجل وهو يقول والله لا ازيد على هذا ولا انقص منه فقال رسول الله صلى الله عليه وسلم افلح ان صدق۔

(مسلم - باب بيان الصلوات التى هى احد اركان الاسلام)

اہل نجد کا ایک پراگندہ بال شخص رسول اللہ کے پاس آیا۔ ہمیں اس کی آواز کی بھنبھناہٹ سی تو سنائی دیتی تھی لیکن باتیں سمجھ میں نہ آتی تھیں۔ جب وہ رسول اللہ کے قریب پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہ اسلام کے بارے میں پوچھ رہا ہے۔ رسول اللہ نے اسے بتایا، 'پانچ نمازیں دن رات میں'۔ اس نے پوچھا، 'اس کے علاوہ بھی میرے اوپر کچھ واجب ہیں؟' آپ نے فرمایا 'نہیں بجز اس کے کہ رضاکارانہ پڑھنا چاہو ۔۔۔ اور ماہِ رمضان کے روزے فرض ہیں'۔ اس نے کہا، 'ان کے سوا بھی کچھ روزے واجب ہیں؟' آپ نے فرمایا 'نہیں، بجز اس کے کہ تم اپنی خوشی سے رکھو'۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے زکوٰۃ کا تذکرہ کیا تو اس نے پوچھا، 'اس کے سوا بھی میرے ذمہ کچھ ہے؟' آپ نے فرمایا 'نہیں بجز اس کے کہ تم اپنی خوشی سے انفاق کرو'۔ راوی بیان کرتے ہیں وہ آدمی یہ کہتا ہوا واپس ہوا کہ 'اللہ کی قسم میں نہ اس سے زیادہ کروں گا اور نہ اس میں کمی کروں گا'۔ رسول اللہ نے فرمایا، 'یہ فلاح پا گیا اگر سچا ثابت ہوا'۔

امام بخاری نے یہی روایت کتاب الصوم میں طلحہ بن عبید اللہ ہی سے لی ہے۔ اس میں سائل کے سوالات 'ماذا فرض اللہ علی' (اللہ تعالےٰ نے میرے اوپر کیا فرض کیا ہے) کے الفاظ کے ساتھ بیان ہوئے ہیں۔ اور آدمی کے رخصت ہونے کا کلمہ ان الفاظ میں ہے 'والذی اکرمک لا اتطوع شیئا ولا انقص مما فرض اللہ علی شیئا' (اس ذات کی قسم جس نے آپ کو عزت بخشی میں نفلی عبادت تو نہ کر سکوں گا لیکن جتنا کچھ اللہ نے فرض کر دیا ہے اس میں کوئی کمی نہ کروں گا۔)

یہ روایت بھی مذکورہ صدر روایت کے ساتھ اس قدر مماثلت رکھتی ہے کہ اسی واقعہ کا ایک اور بیان معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس میں سائل کے سوالات کا انداز اور کائنات سے استدلال کا ذکر نہیں آیا۔ اس کی توجیہ راوی طلحہؓ کی اس بات سے بخوبی ہو جاتی ہے کہ وہ پوری بات سن نہیں پاتے۔ اس کی وجہ شاید بدو سے دوری تھی یا اس کا لہجہ ان کے لئے ناقابلِ فہم تھا۔

وضاحتِ حدیث:

اس حدیث میں حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ ممانعتِ سوال کے حکم کے بعد ہماری یہ خواہش ہوتی تھی کہ کوئی بدو جو اس پابندی سے بے خبر ہو، آکر حضورؐ سے سوال کرے تو وہ ہمارے اشتیاقِ علم کو پورا کرنے کا سامان کرے۔ ممانعت سوال کے حکم سے مراد قرآن مجید کی آیت 'یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا

لَا تَسْئَلُوْا عَنْ اَشْیَآءَ اِنْ تُبْدَ لَکُمْ تَسُؤْکُمْ (المائدہ۔ ۱۰۱) (اے ایمان والو! ان چیزوں کی بابت سوال نہ کرو جو اگر تمہارے لئے کھول دی جائیں تو تمہیں بری لگیں) کا حکم ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس آیت کے نزول کے بعد صحابہ کرامؓ بے حد محتاط ہوگئے اور دین کے بارے میں سوالات کرنے سے گریز کرنے لگے مبادا وہ اس حکم کی خلاف ورزی کے مرتکب قرار پائیں۔ لیکن شوقِ علم و جستجو کا یہ حال تھا کہ نگاہیں متلاشی رہتی تھیں کہ اس حکم سے کوئی ناواقف آدمی آنحضرتؐ کی مجلس میں سوال کر بیٹھے اور ہم اس چشمۂ صافی سے سیراب ہوں۔ اللہ کریم نے صحابہؓ کرام کی اس ضرورت کو پورا کرنے کا سامان فرمایا۔ ایک مرتبہ جبریل امینؑ سائل کی شکل میں آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس موقعہ پر ضمام بن ثعلبہ نے یہ ضرورت پوری کی۔

ضمام بن ثعلبہ تک حضورؐ کی رسالت کا پیغام آپ کے کسی قاصد کے ذریعے پہنچا تھا۔ انھوں نے معاملے کو واقعی اہمیت دی جس کا وہ مستحق تھا۔ انھوں نے ایک بڑی حقیقت کو جس نے عربوں کی صدیوں کی روایات کو پامال کر کے رکھ دیا تھا بلاتحقیق تسلیم کر لینا مناسب نہیں سمجھا۔ انھوں نے اپنے قبیلہ کا وفد تیار کیا لیکن وفد کے آگے آگے خود مدینہ منورہ پہنچ گئے۔ سواری سے اترتے ہی سیدھے حضورؐ کی خدمت میں گئے۔ وہاں بدویانہ سادگی لیکن بے باکی سے نہایت دوٹوک انداز میں حضورؐ سے استفسارات کیے۔ تعارف حاصل کرنے کے بعد پہلے تو انھوں نے یہ جانچا کہ کیا حضورؐ ان کے اس مسلّمہ کو مانتے ہیں یا نہیں کہ آسمان، زمین اور پہاڑوں کو پیدا کرنے والا اللہ ہے۔ جب آنحضرتؐ نے اقرار کیا کہ کائنات کی تمام چیزوں کا خالق اور رب اللہ ہے تو انھوں نے بقیدِ قسم پوچھا کہ کیا واقعی اللہ تعالیٰ نے آپ کو رسالت کے منصب پر فائز کیا ہے؟ حضورؐ نے جب قسم کھا کر اپنی رسالت کا اقرار فرمایا تو انھوں نے ان بنیادی احکام کے بارے میں جو قاصد کے ذریعے معلوم ہوتے تھے یہ تسلی چاہی کہ کیا وہ واقعی اللہ تعالےٰ کی منشا کے مطابق ہیں اور اگر ہیں تو ان کا کتنا حصہ لازمی ہے۔

سائل اگرابھی اسلام سے روشناس ہی ہوا تھا اور محض بنیادی احکام کی تحقیق کے درپے تھا تو اس نے اللہ تعالےٰ کی صفات کے بارے میں کیسے صحیح نتائج اخذ کر رکھے تھے، یہ بات اس لئے بعید از قیاس نہیں معلوم ہوتی کہ مشرکین عرب کائنات کے خالق، مالک اور رب کی حیثیت صرف اللہ تعالےٰ کو دیتے تھے۔ ان کا جرم یہ تھا کہ وہ اس بنیادی حقیقت کو ماننے کے بعد ان کاموں میں دوسروں کی حصہ داری کے بھی قائل تھے۔ ان کے خیالات پر قرآن مجید کا تبصرہ سورۂ مومنون کی ان آیات میں دیکھیے:

قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ	پوچھو، زمین اور جو کچھ اس میں ہے کس کا ہے
كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ	اگر جانتے ہو؟ وہ کہیں گے اللہ کا۔ کہو پھر
قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝ قُلْ مَنْ	کیا تم نصیحت نہیں پاتے؟ پوچھو سات
رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ	آسمانوں اور عرشِ عظیم کا رب کون ہے؟
الْعَظِيْمِ ۝ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ	کہیں گے اللہ۔ کہو کیا تم ڈرتے
اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ (المومنون ۲۳: ۸۴-۸۷)	نہیں؟

پس سائل اچھی طرح جانتا تھا کہ آسمان، زمین اور پہاڑوں کا بنانے والا اللہ ہے۔ وہ کسی ایسے شخص کو سچا ماننے کے لئے تیار نہ تھا جو اس حقیقت کو تسلیم نہ کرتا ہو۔ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب سے وہ مطمئن ہوگیا کہ آپ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں تو اسے گویا ایک قدرِ مشترک اعتماد کے لیے مل گئی۔ اسے یقین ہوگیا کہ آپ بہرحال حقیقت کے منافی کوئی بات نہیں کہیں گے لیکن مزید احتیاط کے لیے اس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قسم کھانے کو کہا۔ قسم مخاطب کو سنجیدہ اور محکم بات کرنے پر آمادہ کرنے کے لئے اب بھی مستعمل ہے اور اس وقت کے عربوں میں بھی تھی۔ بدو کے بقیہ قسم حضورؐ سے سوالات کرنے کا مقصد یہ تھا کہ اگر آپ کائنات کے رب اور خالق کو مانتے ہیں تو اس کے حوالے سے جو بات کریں گے اس میں کسی ذاتی رائے کو دخیل نہ ہونے دیں گے بلکہ بے کم وکاست اصل صورتِ واقعہ بتائیں گے۔

غور کیا جائے تو بدو کا اندازِ گفتگو نہایت عاقلانہ اور فطری معلوم ہوتا ہے۔ بعض روایات میں اس پر آنحضرتؐ کا یہ تبصرہ بھی نقل ہوا ہے کہ فقہ الرجل (آدمی سمجھ دار ہے) اور حضرت عمر فاروقؓ فرمایا کرتے تھے "ما رایت احدا احسن مسألۃ ولا اوجز من ضمامؓ" (میں نے ضمام سے زیادہ خوبصورت اور مختصر سوال کرنے والا نہیں دیکھا)۔ انسان کو عقل وفہم کا جو شرف حاصل ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ کائنات کو کھلی آنکھوں سے دیکھے۔ اس مشاہدہ کے نتیجہ میں آسمان کی وسعتیں، زمین کی صلاحیتیں، شمس وقمر کا نظام، لیل ونہار کی گردش، بحر و بر کے عجائبات ایک خالق، مالک اور رب کے حاکمِ مطلق ہونے کی شہادت دیتے نظر آتے ہیں۔ ایک بندہ جب اپنا حاکمِ مطلق اسی ایک رب کو مان لے تو اس کا احساسِ ذمہ داری اسے مجبور کرتا ہے کہ وہ اس کی مرضیات سے واقف ہونے کی کوشش کرے۔ اللہ تعالے اپنی مرضی کا شعور ہر بندے کو انفرادی طور پر نہیں دیتا بلکہ اپنے رسول کو دیتا ہے جو اس کی تبلیغ کرتے ہیں۔ اس لئے اللہ کا حق بندگی ادا کرنے کے لئے رسول کو واسطہ بنانا

لازم ہوتا ہے۔ گویا رسول پر ایمان، اللہ پر ایمان ہی کا ایک تقاضا ہے۔ اللہ سے صحیح تعلق کے لئے جب ایک رسول کی ذات پر انحصار کرنا ضروری ہوا تو یہ امر تحقیق طلب ہو جاتا ہے کہ جو شخص منصبِ رسالت پر فائز ہونے کا دعوٰی کر رہا ہے وہ سچا بھی ہے یا نہیں۔ ایسا تو نہیں کہ وہ محض لوگوں کی عقیدت کا مرجع بننے کے لئے قربِ خداوندی کا دعوٰی کر رہا ہو۔ کسی شخص کے مزعومات وعقائد، علم وعمل اور اخلاق وکردار کا مشاہدہ اس سے مل کر جس خوبی سے ہو سکتا ہے، کسی دوسرے طریقہ سے نہیں ہو سکتا اور تحقیق کے بعد اگر ثابت ہو جائے کہ ایک شخص واقعی خدا کا پیغمبر ہے تو پھر بندۂ مومن کے لئے اس کا فرمایا ہوا حرف آخر ہوتا ہے۔ دین کے معاملہ میں ضمام کا اندازِ فکر اور طریقۂ تحقیق ٹھیک یہی تھا۔

مذکورہ تمام روایات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ضمام کے پیش نظر اسلام کے ان بنیادی انفرادی فرائض کے بارے میں پوچھنا تھا جن کے وہ مکلف تھے۔ وہ جاننا چاہتے تھے کہ نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ کے احکام اگر من جانب اللہ ہیں تو ان کا کس قدر حصہ فرضِ عین ہے۔ جس کو ادا کرنے میں کوتاہی کو راہ نہ دی جانی چاہیے۔ ایک محتاط اور فرض شناس آدمی کی ہمیشہ یہ خواہش ہوتی ہے کہ اسے اس کی ذمہ داری کی حدود متعین کر کے بتا دی جائیں تاکہ وہ اپنے فرض میں کوتاہی کا مجرم نہ گردانا جائے۔ اس کی اس خواہش کے پیچھے یہ جذبہ کارفرما نہیں ہوتا کہ وہ اس سے زائد کسی ذمہ داری سے جان چھڑانا چاہتا ہے۔ بلکہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی حق اس کے ذمہ ادا ہونے سے رہ نہ جائے۔ ضمام کے سوالوں کے جواب میں حضورؐ نے یہ واضح فرمایا کہ ایک مومن پر دن رات کے دوران پانچ نمازیں ادا کرنا، سال بھر کے دوران ماہِ رمضان کے روزے رکھنا، مال میں سے زکوٰۃ کی معینہ مقدار غرباء و مساکین کو دینا اور اگر استطاعت ہو تو حج کرنا فرضِ عین ہے لیکن نمازیں بطور نفل بھی پڑھی جاسکتی ہیں، ماہِ رمضان کے سوا نفل روزے رکھے جاسکتے ہیں، زکوٰۃ کی مقدار سے زائد انفاق کیا جاسکتا ہے اور حج کے بعد عمرہ کی نفل عبادت کی جاسکتی ہے۔ البتہ ان عبادات کا انحصار ایک بندۂ مومن کی اپنی خوشدلی پر ہے۔ اسے اس کے لئے مجبور نہیں کیا گیا۔

سائل کے سوالات کے ایک خاص پس منظر اور اس کی افتادِ طبع کے لحاظ سے یہ سمجھنا دشوار نہیں کہ اس حدیث میں باقی احکامِ دین کا تذکرہ کیوں نہیں۔ ظاہر ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سائل کے سوال کی حد تک اپنے جوابات کو محدود رکھا۔ یہ موقع اس مقصد کے لئے غیر موزوں تھا کہ ایک نئے مسلمان کو احکامِ اسلام کی ایک جامع وکامل فہرست بتائی جاتی جبکہ اس کی ایک ایک بات اس کی سنجیدگی، فرض شناسی اور ذمہ داری کی گواہی دے رہی تھی۔

اصل میں دین کے بنیادی واجبات باقی دین کے آنے کا دروازہ ہیں۔ اگر ان کو کوئی شخص مانے تو اس کے اندر دین کے گھسنے کی کوئی راہ پیدا نہیں ہوتی لیکن جب نماز زندگی میں داخل ہوتی ہے تو اپنے جلو میں مزید بہت سی نیکیاں لاتی ہے۔ زکوٰۃ نیکیوں کے ایک مختلف گروہ کی سربراہ ہے۔ یہ زندگی میں تنہا داخل نہیں ہوتی بلکہ جب ایک بندہ زکوٰۃ پر کاربند ہوتا ہے تو اس گروہ کی تمام نیکیاں ازخود اس کے ہمراہ داخل ہو جاتی ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس روزہ اور حج کی عبادات تقویٰ کی وہ آبیاری کرتی ہیں کہ نیکیوں کا باغ لہلہا اٹھتا ہے۔ پس بنیادی واجبات دین ایک بندۂ مومن کی پوری زندگی کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتے۔ انہی کے راستے سے اس کے اخلاق و کردار اصلاح پذیر ہوتے ہیں۔ ضمام کا واجبات دین میں تحقیق و جستجو اور عزم عمل کا رویہ اس بات پر شاہد تھا کہ یہ مردِ حق نیکی سے جان چھڑانے والا شخص نہیں۔ بلکہ جو جو فرائضِ دین آگے اس کے علم میں آتے جائیں گے وہ اپنے قلب سلیم کی بدولت ان کی طرف ہدایت پائے گا۔

باقی رہا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا نوافل پر اصرار نہ کرنا، تو موقع و محل اسی کا متقاضی تھا۔ جب سائل سوال ہی فرائض کی حدود جاننے کے لئے کر رہا تھا تو حضورؐ کا اُسے دوسری طرف متوجہ کرنا ایک بے جوڑ سی بات ہوتی۔ تربیت کے نقطۂ نظر سے بھی عمل میں مناسب ترتیب یہ ہے کہ ایک شخص کو پہلے فرائض پر مستحکم کیا جاتے۔ اس کے بعد اس کے اندر نوافل کے لئے قدم اٹھانا خود بخود آسان ہو جاتا ہے۔ اگر شروع میں نوافل کا بوجھ ڈالنے کی کوشش کی جاتے تو طبیعت کی عدم مناسبت کے باعث ہو سکتا ہے کہ فرائض کی طرف میلان میں بھی کمی آ جاتے۔ یوں بھی آدمی کی عمر، مزاج، دلچسپیاں، ماحول اور زندگی کے تجربات اس کے رویہ پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ جب وہ صحیح طرزِ زندگی کو اختیار کر لیتا ہے تو اس کی طبیعت میں نیکی کے ساتھ سازگاری بڑھتی چلی جاتی ہے اور وہ بالآخر ان کاموں میں دلچسپی لینے لگتا ہے جن سے ایک وقت میں اس کی طبعی مناسبت نہ تھی۔

طلحہ بن عبید اللہ کی روایت میں یہ بات قابل غور ہے کہ حضورؐ نے سائل کے رجحانِ طبع کو جاننے کے باوجود ہر فرض کے بیان کے ساتھ "الا ان تطوع" کے الفاظ فرماتے ہیں۔ ایک مرتبہ بھی آپ ان الفاظ کے دُہرانے سے نہیں چوکے۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ حضورؐ ادائیگی فرض کے بعد کا تقاضا بہرحال سائل کو بتا رہے تھے تاکہ اسے یہ تاثر نہ ملے کہ بس فلاں فرائض کی حد سے آگے دین کا مقتضیٰ کچھ ہے ہی نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ اہتمام آپ نے اس لئے کیا ہوگا کہ سائل ہر حکم کے بارے میں جانے کہ دین نے اس کی کم از کم حد متعین کرنے کے بعد بندے کی طرف سے اس میں رضاکارانہ

اضافہ کو پسند کیا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرائض پر عمل کے نتیجہ میں جنت کی نوید سنائی۔ لیکن "ان صدق" کے الفاظ استعمال فرمائے۔ صدق کا لفظ قول و عمل کی سچائی اور پختہ کاری کے لئے آتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایک آدمی اگر سچا اور پکا مسلمان ہے اور وہ فرائض کو پوری باقاعدگی اور تندہی سے ادا کرتا ہے تو اس کے لئے بخشش ہے۔ دوسری احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نوافل ترقی درجات کے لئے ضروری ہیں۔ جوں جوں ایک بندہ نوافل میں بڑھتا ہے، اُسے خدا کا قرب زیادہ حاصل ہوتا چلا جاتا ہے۔ گویا نجاتِ اخروی کے لئے تو محض فرائض پر سچے دل سے کاربند ہونا کافی ہے لیکن اہل جنت کے مابین مزید عزت و عظمت حاصل کرنے کے لئے فرائض کے علاوہ اپنی خوشی سے مزید عبادت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ فرائض کی کماحقہٗ تعمیل بہت دشوار ہے۔ عبادات جس اخلاص، توجہ الی اللہ اور آداب کی متقاضی ہیں ان کا حق دنیا کی مشغولیتوں میں ادا کرنا حد درجہ مشکل ہوتا ہے۔ اس طرح فرائض میں جو خامی پیدا ہو جاتی ہے نوافل اس کو دور کرنے یا کمی کی تلافی کرنے میں مدد دیتے ہیں۔ تاہم اگر کسی کا متعین سوال ہی یہ ہو کہ فلاح کے لئے کم از کم کتنا عمل درکار ہے تو اس کا جواب یہی ہوگا کہ دین کے فرائض کی پابندی۔

اصول تدبر حدیث

امین احسن اصلاحی

قرآن اور حدیث و سُنّت کا باہمی تعلق

قرآن اور حدیث وسنت میں نہایت گہرا باہمی تعلق ہے۔ ان کا معنوی تعلق روح اور قالب کا اور ظاہری تعلق اجمال وتفصیل کا ہے۔ دونوں دین کے قیام کے لیے یکساں ضروری ہیں۔ ہم ایک کو دوسرے سے الگ نہیں کرسکتے۔ دونوں کا اتباع اور احترام یکساں واجب ہے۔

قرآن مجید نے زندگی کا جو نقشہ پیش کیا ہے اس کے صرف چاروں گوشے متعین کر دیے ہیں اس کے اندر رنگ بھرنے کا کام پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر چھوڑ دیا۔ اس کو ممثل اور متشکل کرنا سنت کا کام ہے قرآن نے دین کے کلیات اور اصول ومبادی پر جامع بحث کی ہے، لیکن کسی باب میں بھی تفصیلات اس میں نہیں ملتیں۔ ان کے لیے سنت اور حدیث کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ مثلاً عبادات میں نماز کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ جہاں تک اس کے فلسفہ، دین میں اس کے مقام، اس کے بنیادی ارکان اور زندگی کے معاملات میں مختلف نوعیتوں سے اس کے دخیل ہونے کا تعلق ہے تو یہ چیزیں قرآن سے پوری طرح معلوم ہو جاتی ہیں لیکن یہ کہ نماز کن اوقات میں پڑھی جائے، کس طرح پڑھی جائے، اس میں کیا پڑھا جائے، کن نمازوں کی حیثیت واجبات کی ہے، کن کی حیثیت نوافل کی ہے؛ ان سب تفصیلات کو جاننے کے لیے ہمیں سنت اور حدیث کے علم کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ ان امور کے متعلق بس اشارات کی حد تک رہنمائی قرآن سے مل سکتی ہے۔

یہی حال دیگر عبادات، معاشی معاملات، معاشرتی مسائل، سیاسی امور، حدود و تعزیرات وغیرہ کا بھی ہے۔ شریعت کے احکام کو آپ قرآن کے فریم میں سمجھ سکتے ہیں، لیکن اس خاکے میں رنگ بھرنا سنت کے ذریعے سے ہوتا ہے۔ مفرد احکام کی نوعیت قدرے مختلف ہے۔ یہ کہنا تو مشکل ہے کہ ہر حکم کے فہم کے لئے سنت کی ضرورت ہے۔ لیکن یہ بات واضح ہے کہ اگر کسی پہلو سے ایک حکم کی توضیح کی ضرورت پڑے گی تو حدیث وسنت بھی ممد و معاون بنیں گی۔

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت معلم شریعت:

قرآن مجید کی رو سے زندگی کے نقشے میں رنگ بھرنے کا کام نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے محض بطور احسان

کے نہیں کیا ہے، بلکہ بطور فریضۂ نبوت کے کیا ہے۔ یہ کام آپ کی نبوت کا جزو لاینفک ہے۔ آپ نے ایک معلم کی طرح پوری دل سوزی اور بے مثل شفقت کے ساتھ لوگوں کو قرآن کی تعلیم دی۔ آپ کا معلم ہونا آپ کے منصب رسالت ہی کا ایک پہلو ہے۔ اس وجہ سے اپنی اس حیثیت میں آپ نے جو کچھ لوگوں کو بتایا اور سکھایا اس کو آپ کے فرائض نبوت سے نہ تو خارج کیا جا سکتا اور نہ اس کا درجہ اصل کتاب کے مقابل میں گرایا جا سکتا ہے۔ اس لیے کہ آپ قرآن مجید کے صرف سنا دینے والے نہ تھے، جیسا کہ منکرین سنت کا گمان ہے، بلکہ اس کے معلم اور مبین بھی تھے۔ جیسا کہ قرآن کا بیان ہے:

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَإِن كَانُوا مِن قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُّبِينٍ ۝ (الجمعۃ-۶۲:۲)

وہی خدا ہے جس نے اٹھایا اُمیوں میں ایک رسول انہی میں سے جو ان کو اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے اور ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور بے شک یہ لوگ اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں تھے۔

جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے احکامی آیات کے اجمالات کی وضاحت فرمائی اسی طرح حکمت کے جو دقیق اشارات قرآن میں ہیں ان کی بھی وضاحت فرمائی۔ یہی چیز ہے جس کی بابت نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

الا انی اوتیت القرآن و مثلہ معہ[1]

دیکھو، مجھے قرآن دیا گیا اور اس کے مثل اور بھی۔

اس تفصیل سے یہ معلوم ہوا کہ سنت مثل قرآن ہے۔ سنت اپنے ثبوت میں بھی ہم پایۂ قرآن ہے۔ اس لیے کہ قرآن امت کے قولی تواتر سے ثابت ہے اور سنت عملی تواتر سے۔ ہم ان دونوں کو مقدم و مؤخر نہیں کر سکتے اور کسی کو ادنیٰ و اعلیٰ نہیں قرار دے سکتے۔ دونوں دین کے قیام کے لیے یکساں ضروری ہیں۔

---

[1] الکفایۃ فی علم الروایۃ، باب ماجاء فی التسویۃ بین حکم کتاب اللہ تعالیٰ وحکم سنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی وجوب العمل ولزوم التکلیف۔

قرآن اور حدیث و سنت کے بارے میں غیر متوازن خیالات کا آغاز کس طرح ہوا ؟

قرآن اور حدیث و سنت کا فطری تعلق یہی ہے ۔ لیکن صدر اوّل میں روایتِ حدیث کی روز افزوں مقبولیت کی وجہ سے جب لوگوں نے بلا تحقیق حدیثیں بیان کرنا شروع کر دیں تو ضعیف احادیث کے توغل نے بعض محتاط لوگوں کے اندر حدیث بیزاری کا رجحان پیدا کیا اور انھوں نے اس طریقے کی باتیں کرنا شروع کر دیں کہ بھئی دیکھو، جو کچھ بیان کرنا ہو، خدا کے واسطے قرآن ہی سے متعلق بیان کرنا اس سلسلے میں روایات بہت ہیں ۔ ہم صرف ایک جامع روایت نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن اور حدیث و سنت کے بارے میں غیر متوازن خیالات کا آغاز کس طرح ہوا ۔

عن الحسن ان عمران بن حصین کان جالساً ومعہ اصحابہ فقال رجل من القوم: لا تحدثونا الا بالقرآن. قال: فقال لہ: ادنہ ۔ فدنا. فقال: ارایت لو وکلت انت واصحابک الی القرآن، اکنت تجد فیہ صلاۃ الظہر اربعاً، وصلاۃ العصر اربعاً، و المغرب ثلاثاً، تقرا فی اثنتین ارایت لو وکلت انت واصحابک الی القرآن اکنت تجد الطواف بالبیت سبعاً والطواف بالصفا والمروۃ، ثم قال: ای قوم خذوا عنا، فانکم واللہ ان تفعلوا لتضلن [1]

حسن سے روایت ہے کہ عمران بن حصین اپنے اصحاب کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے لوگوں میں سے ایک شخص نے کہا کہ یہاں کوئی شخص ہمارے سامنے جو کچھ بیان کرے بس قرآن سے بیان کرے ۔ عمران بن حصین نے فرمایا: ذرا ان کو میرے قریب کرو وہ قریب آئے تو عمران نے ان سے فرمایا: فرض کرو کہ تمھیں تنہا قرآن پر چھوڑ دیا جائے تو کیا تم اس میں پا سکتے ہو کہ ظہر چار رکعت عصر چار رکعت اور مغرب تین رکعت ہے اور اس کی دو رکعتوں میں تمھیں قرات کرنی ہے؟ اسی طرح کیا تم قرآن میں پا سکتے ہو کہ بیت اللہ کا سات بار طواف کرنا ہے اور صفا و مروہ کا بھی طواف ہے؟ اس کے بعد انھوں نے لوگوں سے خطاب کر کے فرمایا: اے لوگو، ہم سے سیکھو اگر ایسا نہ کرو گے تو گمراہ ہو جاؤ گے ۔

بعض دوسری روایات میں یہی مضمون اس سے زیادہ تفصیل کے ساتھ آیا ہے اس کے مطابق عمران نے بعض تعزیرات کو لے کر کے ان کے متعلق وضاحت کی کہ تم ان کے تفصیلی احکام کیسے

[1] الکفایۃ فی علم الروایۃ، باب تخصیص السنن لعموم محکم القرآن و ذکر الحاجۃ فی المجمل الی التفسیر والبیان ۔

جان سکتے ہو ۔

حدیث بیزاری کا ردِ عمل، دوسری طرف' ایک گروہ پر' قرآن بیزاری کی شکل میں ہوا اور اس کے اندر، حدیث کے غلو نے یہ شکل اختیار کر لی کہ بعض لوگوں نے اعلانیہ اس کو قرآن پر ترجیح دینی شروع کر دی ۔ چنانچہ مکحول کا ایک قول منقول ہے کہ:

القرآن احوج الی السنۃ من السنۃ الی القرآن [1]

سنت جتنی قرآن کی محتاج ہے اس سے زیادہ قرآن سنت کا محتاج ہے ۔

اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ ان کے نزدیک سنت قرآن کی اتنی محتاج نہیں جتنا کہ قرآن سنت کا محتاج ہے ۔ یہ صاف صاف ترجیح دینے کی بات ہے اور ظاہر ہے کہ مبالغہ آمیز ہے ۔

یہ بڑھتے بڑھتے یہاں تک بڑھ گئی کہ ایک بزرگ یحییٰ بن کثیر کا قول نقل ہوا ہے کہ:

السنۃ قاضیۃ علی الکتاب لیس الکتاب قاضیاً علی السنۃ [2]

سنت حاکم ہے کتاب اللہ پر، کتاب اللہ سنت پر حاکم نہیں ہے ۔

گویا اس کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ العیاذ باللہ، رسول اللہؐ اللہ تعالیٰ پر حاکم ہیں، اللہ تعالیٰ رسول کے اوپر حاکم نہیں یہ بھی بات کے کہنے ہی کی غلطی ہے ۔ غلو سے غلو پیدا ہوتا ہے اور غلطی سے غلطی ۔

یعنی ایک چیز کی مارکیٹ میں مانگ بڑھی تو رطب و یابس' ہر چیز آنے لگی ۔ لوگوں نے اس کے خلاف بیزاری کا جو اظہار کیا تو اس کے جواب میں' ردِ عمل کے طور پر اس کی حمایت کا غلو پیدا ہوا ۔ یہاں تک کہ یہ دونوں چیزیں یعنی قرآن اور حدیث و سنت ایک دوسرے کی حریف' ایک دوسرے کے مقابل میں لا کر رکھ دی گئیں ۔

سوچنے کی بات ہے کہ اگر قرآن نہ ہو تو سنت کیا کرے گی ؟ اس کی عمارت کس چیز پر استوار ہوگی ؟ سنت کی اساس تو بہر حال قرآن مجید ہی ہے ۔ اس کے بغیر سنت کھڑی نہیں ہو سکتی واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں میں روح اور قالب کا تعلق ہے ۔ ان میں اجمال و تفصیل کا تعلق ہے ۔ یہ دونوں

[1] الکفایۃ فی علم الروایۃ، باب تخصیص السنن لعموم محکم القرآن و ذکر الحاجۃ فی المجمل الی التفسیر والبیان ۔

[2] الکفایۃ فی علم الروایۃ، باب تخصیص السنن لعموم محکم القرآن و ذکر الحاجۃ فی المجمل الی التفسیر والبیان ۔

اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہیں۔ دونوں یک جان دو قالب ہیں اور ہم ان دونوں کے یکساں محتاج ہیں۔

حدیث و سنت قرآن کی ناسخ نہیں ہو سکتیں:

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ امتِ مسلمہ میں ہمیشہ ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے ہیں جنہوں نے غالی فتنہ پردازوں کے مقابل میں امت کی ہمیشہ صحیح راستے کی طرف رہنمائی کی ہے۔ چنانچہ اس مرحلے میں بھی، جب یہ فتنہ اٹھا تو سب سے زیادہ خوبی کے ساتھ جس شخص نے اپنا فرض ادا کیا ہے، وہ حدیث کے سب سے بڑے رازداں اور سب سے بڑے خادم حضرت امام احمد بن حنبل رحمتہ اللہ علیہ ہیں۔ اس قسم کے مبالغہ آمیز اقوال جب ان کے سامنے آئے تو انھوں نے صحیح نقطہ نظر واضح فرمایا، جس کی روایت فضل بن زیاد کے حوالے سے یوں ہوتی ہے:

قال، سمعت احمد بن حنبل وسئل عن الحدیث الذی روی[1]، ان السنۃ قاضیۃ علی الکتاب۔ قال، ما اجسر علی ھذا ان اقولہ، ولکن السنۃ تفسر الکتاب و تعرف الکتاب و تبینہ۔[2]	وہ کہتے ہیں کہ میں نے احمد بن حنبل سے سنا اور ان سے سوال کیا گیا تھا اس قول (حدیث) کے بارے میں جس کی روایت ہوئی کہ السنۃ قاضیۃ علی الکتاب (سنت کتاب اللہ پر حاکم ہے) تو انھوں نے فرمایا کہ مجھی یہ کہنے کی میں جسارت نہیں کر سکتا۔ سنت تو قرآن کی تفسیر کرتی، اس کی تعریف کرتی اور اس کی مجمل باتوں کی وضاحت کرتی ہے۔

یعنی سنت قرآن مجید کی تفسیر، تعریف اور تبیین کا کام کرتی ہے۔ یہ سوال بالکل خارج از بحث ہے کہ کوئی حدیث یا سنت قرآن کی ناسخ ہو سکے۔ سنت اور حدیث کی اہمیت مسلّم ہے، لیکن ان کے قرآن پر حاکم ہونے کا دعویٰ باطل ہے۔

جہاں تک حدیث کا تعلق ہے اس میں ضعف کے اتنے پہلو موجود ہیں کہ اس کا قرآن جیسی قطعی الدلالۃ چیز کو منسوخ کر دینا بالکل خلافِ عقل ہے۔ ان پہلوؤں کی طرف ہم "حدیث اور سنت میں فرق" کے تحت اشارہ کر چکے ہیں۔ یہاں اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔

---

[1] اس سے مراد یحییٰ بن کثیر کا مذکورہ بالا قول ہی ہو سکتا ہے کوئی مرفوع حدیث اس باب میں معلوم نہیں ہے۔

[2] کتاب الکفایۃ فی علم الروایۃ، باب تخصیص السنن لعموم محکم القرآن و ذکر الحاجۃ فی المجمل الی التفسیر والبیان۔

سنت اگرچہ ان کمزوریوں سے محفوظ ہوتی ہے، لیکن وہ قرآن کے کسی حکم کی ناسخ اس وجہ سے نہیں ہو سکتی کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حق سرے سے حاصل ہی نہیں تھا کہ آپ قرآن کے کسی حکم میں سرِ مو تبدیلی کر سکیں۔ چنانچہ قریش نے جب یہ مطالبہ کیا کہ جب تک آپ قرآن میں تبدیلی نہیں کریں گے اس وقت تک وہ اس کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں تو ان کو آپ کی زبانی یہ جواب دلوایا گیا:

قُلْ مَا يَكُونُ لِي أَنْ أُبَدِّلَهُ مِن تِلْقَاءِ نَفْسِي (یونس ۱۰:۱۵)	کہہ دو، مجھے کیا حق ہے کہ میں اس میں اپنے جی سے ترمیم کر دوں۔

قرآن مجید خدا کی طرف سے آیا ہے تو اس میں تبدیلی کا حق اسی کو ہے۔ اس کے کسی حکم کو تبدیل کیا ہے تو اللہ تعالیٰ ہی نے کیا ہے اور ناسخ اور منسوخ دونوں قرآن میں موجود ہیں۔ پیغمبر خدا کی طرف سے مامور ہے کہ اس کو خدا کی طرف سے جو بتایا جائے وہ ٹھیک ٹھیک اس کے بندوں کو پہنچا دے اور پھر بندوں کی ضرورت کے لحاظ سے اس کی تفسیر اور تبیین کر دے۔ اس میں وہ سرِ مو کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ اُس کو اس کا کوئی حق نہیں ہے چاہے ساری خدائی اُس کی دشمن بن جائے۔ جب پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ مقام ہی نہیں ہے کہ وہ قرآن کے کسی حکم کو منسوخ کر سکیں تو ان کی طرف منسوب کسی سنت یا حدیث کو آپ یہ درجہ کس طرح دے سکتے ہیں کہ وہ قرآن میں کوئی تبدیلی کر سکتی ہے۔

کیا قرآن کے کسی حکم کی تخصیص حدیث و سنت سے ہو سکتی ہے؟

اب رہا یہ سوال کہ نسخ نہ سہی، لیکن حدیث و سنت سے قرآن کے کسی حکم کی تخصیص ہو سکتی ہے یا نہیں؟ یعنی قرآن کے کسی عام حکم کو حدیث و سنت سے خاص کر دیا جائے۔ اس کے جواب میں تھوڑی سی تفصیل ہے:

(۱) اگر تخصیص کی نوعیت یہ ہے کہ اس سے قرآن کا کوئی عموم اس طرح محدود و متمیز ہو جائے کہ کسی ایسی چیز کے اس عموم میں شامل ہونے کی راہ مسدود ہو جائے جس کا شامل ہونا لفظ کے مفہوم اور آیت کے منشا کے خلاف ہے تو یہ تخصیص نہ صرف حدیث و سنت کے ذریعے سے، بلکہ ہمارے نزدیک قیاس و اجتہاد کے ذریعہ سے بھی ہو سکتی ہے۔

(ب) اور اگر اس تخصیص سے قرآن کے عموم کے اندر سے کوئی ایسی چیز نکل جاتی ہے جو لفظ کے مفہوم میں واضح طور پر شامل ہے اور اس کے لیے قرآن کے حکم سے بالکل الگ حکم بیان ہوتا ہے جو قرآن کے حکم سے بھی اشد ہے تو یہ تخصیص نہیں بلکہ نسخ ہے۔ اور قرآن کی کسی چیز کے منسوخ کرنے کا اختیار پیغمبر

صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی، جیسا کہ اوپر بیان ہوا، نہیں ہے۔ چہ جائیکہ حدیث و سنت کو یہ درجہ دیا جائے۔

اس کو مثال سے سمجھ لیجیے:

پہلی تخصیص کی مثال یہ ہے کہ چوری پر قطعِ ید کے عام حکم کی تخصیص، مثلاً ربع دینار والی روایت سے کی گئی یعنی قطعِ ید کا حکم صرف ان چوروں پر نافذ ہوگا جنھوں نے کم از کم ربع دینار کی چوری کی ہو۔ متعلقہ آیت یہ ہے:

والسارق والسارقة فاقطعوا	اور چور مرد اور چور عورت، دونوں کے ہاتھ کاٹ
ایدیهما جزآءً بما کسبا	دو، ان کے کیے کی پاداش اور اللہ کی طرف
نکالاً من اللہ ط (المآئدۃ ۵: ۳۸)	سے عبرتناک سزا کے طور پر۔

اس کو تخصیص کرنے والی روایت یہ ہے۔

عن عائشۃ عن النبی صلی اللہ	حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ
علیہ وسلم قال: تقطع ید	علیہ وسلم نے فرمایا کہ چور کا ہاتھ ایک چوتھائی
السارق فی ربع دینار فصاعداً[1]	دینار یا زیادہ مالیت کی چوری پر کاٹا جائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ قطعِ ید کا حکم آیت میں تو عام ہے، لیکن حدیث نے اس کو یوں کر دیا کہ اس پر ربعِ دینار کی قید عائد کر دی۔ یعنی قطعِ ید کا حکم صرف ان چوروں پر نافذ ہوگا جنھوں نے کم سے کم ربعِ دینار کی چوری کی ہو۔ یہ تخصیص لفظ "سارق" کے صحیح مفہوم کی جو آیت میں مراد ہے وضاحت ہے۔ اس لیے کہ "سارق" ہر چھوٹی موٹی چیز اٹھا لینے والے کو نہیں کہتے، بلکہ محفوظ مال میں سے کسی ایسی چیز کی چوری کو کہتے ہیں جس کی کچھ قدر و قیمت ہو۔ یہ گویا لفظ "سارق" کے مفہوم کے مضمرات میں سے ہے جس کو حدیث نے واضح کر دیا۔ اس تخصیص سے آیت کا صحیح مفہوم متعین ہو گیا اور اس کے الفاظ کے عموم سے جو التباس پیدا ہو سکتا تھا اس کی راہ مسدود ہو گئی اس کو تخصیص کہتے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس حکمِ عام میں ایک تخصیص اپنے اجتہاد سے بھی کی۔ وہ یہ کہ قحط کے سال میں قطعِ ید کا حکم ملتوی کر دیا کہ اضطرار کا اندیشہ ہے۔ اس سے ہمارے اس خیال کی تائید ہوتی ہے جو ہم نے اوپر ظاہر کیا ہے کہ یہ تخصیص ایک مجتہد کے اجتہاد سے بھی ہو سکتی ہے۔ اگرچہ اس کی حیثیت ایک امرِ اجتہادی کی ہوگی۔ یہ امر یہاں واضح رہے کہ ایک خلیفہ راشد کے اجتہاد کی دین میں

[1] سنن ابی داؤد، کتاب الحدود، باب فی ما یقطع فیہ السارق۔

بڑی اہمیت ہے۔

اصل یہ ہے کہ ہر عموم کے لیے کچھ فطری قیدیں اور تخصیصات ہوتی ہیں جو اس عموم کی مقترن اور ہمزاد ہوتی ہیں، مثلاً آیتِ توریث اپنے حکم میں عام ہے، جیسا کہ ارشاد ہے:

یوصیکم اللہ فی اولادکم	اللہ تمھاری اولاد کے باب میں تمھیں ہدایت
للذکر مثل حظ الانثیین ج	دیتا ہے کہ لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے۔
فان کن نسآءً فوق اثنتین	اگر لڑکیاں دو سے زائد ہیں تو ان کے لیے ترکے
فلهن ثلثا ما ترک ج وان	کا دو تہائی ہے اور اگر اکیلی ہے تو اس کے لیے
کانت واحدۃً فلها النصف ط	آدھا ہے اور میت کے ماں باپ ان میں
ولابویه لکل واحد منهما	سے ہر ایک کے لیے اس کا چھٹا حصہ ہے جو
السدس مما ترک ان کان	مُورِث نے چھوڑا، اگر میت کے اولاد ہو۔ اور
له ولد ج فان لم یکن له	اگر اس کے اولاد نہ ہو اور اس کے وارث
ولد وورثه ابوٰہ	ماں باپ ہی ہوں تو اس کی ماں کا حصہ ایک تہائی
فلامه الثلث ج فان کان	اور اگر اس کے بھائی بہنیں ہوں تو اس کی ماں
له اخوۃ فلامه السدس	کے لیے چھٹا حصہ ہے۔ یہ حصے اس وصیت
من بعد وصیة یوصی	کی تعمیل یا ادائے قرض کے بعد ہیں جو وہ کر جائے۔
بها او دین ط اٰبآؤکم وابنآؤکم لا تدرون ایهم اقرب	تم اپنے باپوں اور بیٹوں کے متعلق یہ نہیں جان سکتے
لکم نفعاً ط فریضة من اللہ ط	کہ تمھارے لیے سب سے زیادہ نافع کون ہوگا۔
ان اللہ کان علیماً حکیماً ۵	یہ اللہ کا ٹھہرایا ہوا فریضہ ہے بے شک اللہ ہی
(النسآء ۴: ۱۱)	علم و حکمت والا ہے۔

آیت کے حکم کی عمومیت کا ظاہر تقاضا تو یہ ہے کہ ہر باپ اپنے بیٹے کا اور ہر بیٹا اپنے باپ کا وارث ہو، لیکن اس کے اندر یہ تخصیص مضمر ہے کہ اختلافِ دین کی صورت میں یہ عموم باقی نہیں رہے گا بلکہ یہ چیز توارث میں مانع ہو جائے گی۔ اس مضمر حقیقت کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں کھول دیا:

عن اسامة بن زید ان النبی	حضرت اسامہ بن زیدؓ سے روایت ہے کہ
صلی اللہ علیه وسلم قال: لا یرث	نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان
المسلم الکافر ولا	کافر کا اور کافر مسلمان کا وارث نہیں

الکافر المسلم[1] ہو سکتا۔

یہی صورت چوری پر قطع ید کے حکم کے عموم کی ہے۔ اس کا عموم تو بظاہر یہی ہے کہ ہر عمر، ہر حیثیت، ہر معیارِ عقل و فہم کی ہر چوری پر یہ سزا نافذ ہو، لیکن اس عموم کے اندر یہ مضمر ہے کہ چور عاقل و بالغ ہو، اس کی دماغی حالت درست ہو، وہ مبتلائے اضطرار نہ ہو، شے مسروقہ کی مقدار اتنی ہو کہ اس پر چوری کا اطلاق ہو سکے اور فعل کی نوعیت ایسی ہو کہ اس میں تعمد پایا جاتا ہو۔ یہ ساری باتیں اس عموم کے اندر روزِ اوّل سے مضمر ہیں جن کو روایات اور فقہائ کے اجتہادات نے واضح کر دیا۔

دوسری تخصیص' جو نسخ کے حکم میں داخل ہے'، کی مثال وہ ہے جو سورۂ نور کے حکم 'اَلزَّانِیَۃُ وَ الزَّانِیْ..... الاٰیۃ' میں کی گئی ہے کہ بعض روایات کی بنا پر اس کو غیر شادی شدہ کے لیے خاص کر دیا گیا ہے اور شادی شدہ کو اس سے الگ کر کے اس کے لیے ایک مستقل حکم' اس سے بھی زیادہ سخت' بیان کیا گیا ہے، حالانکہ الفاظ اور آیت کے اندر اس امتیاز کے لیے کوئی قرینہ و اشارہ نہیں ہے۔ آیت ملاحظہ ہو:

اَلزَّانِیَۃُ وَالزَّانِیْ فَاجْلِدُوْا	زانی عورت اور زانی مرد، دونوں
کُلَّ وَاحِدٍ مِّنْھُمَا مِائَۃَ جَلْدَۃٍ	میں سے ہر ایک کو سو سو کوڑے
(النور ۲۴: ۲)	مارو۔

اب بھلا بتائیے جب 'اَلزَّانِیَۃُ وَ الزَّانِیْ' کہا جائے تو شادی شدہ اور غیر شادی کا کوئی تصور کہاں حائل ہوتا ہے کہ اس سے شادی شدہ مراد نہیں ہو سکتا۔ دونوں پر اس کا اطلاق ہو تا ہے، اس لیے کہ وہ تمام شرائط، جو زنا کے ہیں، وہ وہاں بھی پائے جاتے ہیں۔ کوئی قرینہ بھی پہلے سے ایسا موجود نہیں ہے جو یہ بتاتا ہو کہ یہاں شادی شدہ کو الگ کر کے اس کو رجم کیا جائے۔ یہ تخصیص نہیں ہے، بلکہ یہ نسخ ہے اور نسخ کے متعلق وہی حکم جو بیان کیا جا چکا ہے۔

ماعز بن مالک اسلمی کے واقعہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تحقیق میں جو اس قدر جزرسی سے کام لیا کہ فقہا نے اس سے یہ حکم نکالا ہے کہ مجرم کی تحقیق میں عریاں زبان استعمال کی جا سکتی ہے تو اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ لفظ "زنا" کے عموم سے جو اشتباہ پیدا ہو سکتا ہے وہ دور ہو جائے اور یہ لفظ اپنے اس مفہوم میں معیّن ہو جائے جو اس کو اصل سزا کا مستحق بناتی ہے۔

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الفرائض، باب لا یرث المسلم الکافر ولا الکافر المسلم و اذا اسلم قبل ان یقسم المیراث فلا میراث لہ۔

فقہا مخصِّص اور مخصَّص میں اقتران کی جو شرط لگاتے ہیں اس کا مطلب یہی ہے کہ اس کے قرائن و آثار روزِ اوّل سے مخصَّص کے اندر موجود ہوتے ہیں۔ اگر کوئی چیز اس طرح کے کسی قرینہ کے بغیر کسی حکم پر وارد ہو جائے تو وہ مخصِّص نہیں، بلکہ وہ ناسخ کہلائے گی اور قرآن میں نسخ کے لئے جو شرط ہے وہ اوپر وضاحت سے بیان ہو چکی ہے۔

(ترتیب: ماجد خاور)

بقیہ:

تعلق باللہ اور اس کی اساسات

من اللّٰہ استحی اللّٰہ منہ' (جو اللہ سے شرماتا ہے اللہ بھی اس سے شرماتا ہے) حضور کے اس ارشاد کے معانی و حقائق پر علما نے بہت کچھ لکھا ہے' لیکن تمام موشگافیوں سے صرف نظر کر کے اگر اس کا مطلب صرف اتنا ہی لیا جائے کہ اللہ تعالیٰ ایسے بندے کی دعاؤں کو رد کرنے سے شرماتا ہے تو یہی اتنی بڑی دولت ہے کہ اس کے حاصل کرنے کے لیے اگر انسان اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دے تو یہ اس کی سب سے بڑی خوش بختی ہوگی۔

امین احسن اصلاحی

تعلق باللہ اور اس کی اساسات (۶)

حیا

ایمان کے تقاضوں میں سے جس طرح خوف اور محبت ہیں، جن کی تفصیل پچھلی فصلوں میں گزر چکی ہے، اسی طرح اس کے بدیہی تقاضوں میں سے حیا بھی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: 'الحیاء شعبۃ من الایمان'[1] (حیا ایمان کے شعبوں میں سے ایک شعبہ ہے)۔

یہاں حیا سے ہماری مراد وہ حیا نہیں ہے جو فطری تقاضوں کے تحت ہم آپس میں ایک دوسرے سے بعض معاملات میں کرتے ہیں، بلکہ اس سے مراد وہ حیا ہے جو ایک بندہ اپنے رب سے کرتا ہے۔ یہی حیا اس حیا کا بھی اصل منبع ہے جو ہم آپس میں ایک دوسرے سے کرتے ہیں۔ اگر یہ حیا ہمارے اندر سے مٹ جائے تو وہ حیا بھی بالآخر مٹ کے رہتی ہے جو ہماری روزمرہ کی زندگی میں حسن و جمال پیدا کرتی ہے۔ اور اگر الف و عادات کے تحت ظاہر میں اس کے کچھ آثار باقی رہتے ہیں بھی تو اس کی کوئی بنیاد نہیں ہوتی اس وجہ سے وہ کسی بادِ مخالف کا مقابلہ نہیں کر سکتی، بلکہ معمولی جھٹکا بھی اس کو بیخ و بُن سے اکھاڑ کے پھینک دیتا ہے۔ چنانچہ آپ دیکھتے ہیں کہ اس زمانے میں خدا سے ناآشنا معاشروں کی بے حیائی اس درجہ بڑھ گئی ہے کہ تہذیب و تمدن کے ادّعا کے باوجود، ان کی پارلیمنٹیں ایسے گھنونے جرائم کو قانونی جواز کی سند دے رہی ہیں جن کا کل تک شریف لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے[2]۔ اس کی وجہ وہی ہے جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا کہ ان کی حیا کا تعلق اصل منبع سے نہیں تھا، بلکہ اس کی بنیاد مجرد رسوم و روایات پر تھی۔ اس وجہ سے رجحانِ عام کی تبدیلی کا مقابلہ وہ نہ کر سکی، بلکہ بدلتے ہوئے حالات سے اس کو شکست کھانی پڑی۔ غالباً یہی مطلب ہے اس حکیمانہ قول کا جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سابق انبیائے کرام کی وراثت قرار دیا ہے۔ یعنی 'اذا لم تستحی فافعل ما شئت'[3] (یعنی جب تم میں خدا کی شرم باقی نہیں رہی تو جو چاہو کرو)۔ یعنی اللہ تعالیٰ

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان عدد شعب الایمان وافضلہا وادناہا وفضیلۃ الحیاء وکونہ من الایمان۔

[2] میں یہاں برطانوی پارلیمنٹ کے بعض قوانین کا حوالہ دینا چاہتا تھا جو حال میں اس نے پاس کیے ہیں، لیکن شرم ان کے ذکر سے مانع ہے۔

[3] صحیح بخاری، کتاب الانبیاء۔

کی شرم ہی انسان کو برائیوں سے بچانے والی ہے۔ جب یہ شرم اٹھ گئی تو کوئی برائی بھی انسان سے بعید نہیں رہی۔

یہ حیا انسان کی زندگی پر گوناگوں پہلوؤں سے اثرانداز ہوتی اور اس کو شیطان کے فتنوں سے بچاتی ہے۔ اس کی اس ہمہ گیری کی طرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں اشارہ فرمایا ہے۔ جامع ترمذی میں مرفوعاً روایت ہے:

عن عبد اللہ بن مسعود قال: قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: استحیوا من اللہ حق الحیاء، قال: قلنا: یا رسول اللہ! انا نستحیی والحمد للہ، قال: لیس ذالک، ولکن الاستحیاء من اللہ حق الحیاء ان تحفظ الرأس وما وعی، والبطن وما حوی، ولتذکر الموت والبلی، ومن اراد الاخرۃ ترک زینۃ الدنیا، فمن فعل ذالک فقد استحیا من اللہ حق الحیاء۔ (جامع ترمذی: کتاب صفۃ القیامۃ، باب ۲۴)

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ سے اس طرح شرم کرو جس طرح اس سے شرم کرنے کا حق ہے۔ لوگوں نے عرض کی: یا رسول اللہ! ہم شرماتے تو ہیں، اللہ کا شکر ہے۔ آپ نے فرمایا: یہ وہ چیز نہیں ہے۔ جو اللہ سے اس طرح شرمائے جس طرح اس سے شرمانے کا حق ہے اس کو چاہیے کہ وہ اپنے دماغ کا اور جو کچھ وہ اس میں جمع کرتا ہے اس کا خیال رکھے، اپنے پیٹ کا اور جو کچھ اس میں بھرتا ہے اس پر نگاہ رکھے؛ اپنی موت کو اور اس کے بعد سڑنے اور گلنے کو یاد رکھے اور جو آخرت کا طالب ہوتا ہے وہ دنیا کی زینتوں کو خیرباد کہتا ہے۔ تو جس نے یہ کام کیے درحقیقت وہ ہے جو اللہ تعالیٰ سے اسی طرح شرماتا ہے، جس طرح اس سے شرمانے کا حق ہے۔

حیا کے اصل عوامل:

اللہ تعالیٰ سے حیا پیدا کرنے میں اصل عامل کی حیثیت اس کی صفات کو ہے۔ جو بندہ اس کی صفتوں کو اچھی طرح جانتا اور ان پر مضبوط ایمان اور ان کا استحضار رکھتا ہے وہی اس سے صحیح معنوں میں شرماتا ہے۔ جو اس کی صفتوں سے بے خبر ہیں یا ان کی یادداشت کے لیے وہ اہتمام نہیں کرتے جو کرنا چاہیے

ان کے اندر نہ خدا سے کسی شرم کا احساس ہوتا ہے نہ بندوں سے۔ ان کی مثال حیوانات کی ہے جو شرم کے احساس سے یک قلم عاری ہیں۔

یہ مسئلہ دقیق ہے، اس وجہ سے ہم چند مثالوں سے یہ واضح کرنے کی کوشش کریں گے کہ اللہ تعالیٰ کی کن صفات کا استحضار آدمی کے اندر اس سے حیا پیدا کرتا ہے اور ان کی اثر انگیزی کی نوعیت کیا ہوتی ہے۔

صفاتِ الٰہی میں سے سب سے زیادہ مؤثر صفات، جو انسان کے اندر خدا سے حیا کے شعور کو بیدار کرتی ہیں، وہ اس کے احاطۂ علم کی صفات ہیں۔ جو بندہ اس بات پر ایمان رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے ہر قول و فعل کی نگرانی کر رہا ہے۔ ﴿إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيبًا﴾ (النسآء ۴: ۱) (بے شک اللہ تمھاری نگرانی کر رہا ہے)، جس کو اس حقیقت کا علم ہے کہ وہ نگاہوں کی خیانتوں اور سینے کے ہر راز سے باخبر ہے: ﴿يَعْلَمُ خَائِنَةَ الْأَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ﴾ (المؤمن ۴۰: ۱۹) (وہ نگاہوں کی چوری بھی جانتا ہے اور ان بھیدوں کو بھی جو سینے چھپائے ہوئے ہیں)؛ جو اچھی طرح جانتا ہے کہ آدمی جہاں کہیں بھی ہو اللہ تعالیٰ ہر جگہ اس کے ساتھ ہے، محفوظ سے محفوظ خلوت خانوں میں بھی کوئی سرگوشی ہو رہی ہو تو وہ وہاں بھی موجود ہوتا ہے ﴿مَا يَكُونُ مِنْ نَجْوَىٰ ثَلَاثَةٍ إِلَّا هُوَ رَابِعُهُمْ وَلَا خَمْسَةٍ إِلَّا هُوَ سَادِسُهُمْ وَلَا أَدْنَىٰ مِنْ ذَٰلِكَ وَلَا أَكْثَرَ إِلَّا هُوَ مَعَهُمْ أَيْنَ مَا كَانُوا﴾ (المجادلۃ ۵۸: ۷) (نہیں ہوتی کوئی سرگوشی تین کے درمیان مگر ان کا چوتھا اللہ ہوتا ہے اور نہ پانچ کے مابین مگر چھٹا وہ ہوتا ہے اور نہ اس سے کم یا زیادہ کی مگر وہ ان کے ساتھ ہوتا ہے جہاں بھی وہ ہوں)۔ ان باتوں پر ایمان رکھنے والے کے لیے یہ ناممکن ہے کہ کسی مخفی سے مخفی گوشے میں بھی وہ کسی ایسی بات کا ارتکاب کر سکے جو اس کے رب کے سامنے اس کو شرمندہ کرنے والی ہو۔ وہ کسی ایسے مقام کا تصور نہیں کر سکتا جہاں اس کو خدا نہ دیکھ سکے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ جہاں بھی کوئی گناہ کرے گا عین اپنے رب کے سامنے کرے گا۔ یہ جسارت ظاہر ہے کہ کوئی ایسا شخص ہی کر سکتا ہے جو انتہائی بے شرم ہو یا انتہائی بے خوف ہو۔ اسی طرح کے لوگوں کے بارے میں سورۂ قیامہ میں فرمایا ہے: ﴿بَلْ يُرِيدُ الْإِنْسَانُ لِيَفْجُرَ أَمَامَهُ﴾ (القیمۃ ۷۵: ۵) (بلکہ انسان تو یہ چاہتا ہے کہ عین اللہ کے سامنے شرارت کرے)۔

اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نہایت غیور ہے۔ قدیم صحیفوں میں یہ صفت بار بار اللہ تعالیٰ کے لئے آئی ہے۔ اس کا تقاضا یہ بیان ہوا ہے کہ خداوند خدا تمھارا خدا غیور ہے، جس طرح تم یہ گوارا نہیں کرتے کہ تمھاری بیوی غیر کی بغل میں سوئے اسی طرح وہ بھی یہ گوارا نہیں کرتا کہ اس کا بندہ کسی غیر کی عبادت کرے۔ میرے نزدیک یہی مضمون ذرا مختلف الفاظ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا ہے:

یا امۃ محمد! ما من احد اغیر من اللہ ان یزنی عبدہ او تزنی امتہ۔ (موطا امام مالک: کتاب الصلوۃ، باب العمل فی صلاۃ الکسوف)	اے امتِ محمد! اس عالم میں کوئی اللہ تعالیٰ سے زیادہ غیور نہیں ہے کہ اس کا بندہ زنا کا مرتکب ہو یا اس کی کوئی بندی زنا کرائے۔

قدیم صحیفوں اور قرآن مجید میں زنا اور شرک، دونوں کو بالکل مماثل جرم قرار دیا گیا ہے۔ اس وجہ سے مجھے خیال ہوتا ہے کہ اس حدیث میں لفظ 'زنا' اپنے حقیقی اور مجازی، دونوں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ ان دونوں کی مشابہت پر میں نے تفسیر تدبر قرآن میں بحث کی ہے اور یہ بھی واضح کیا ہے کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ کی صفتِ متکبر درحقیقت صفتِ غیور کی ایک جامع تعبیر ہے۔

اس کا تیسرا نہایت اہم پہلو یہ ہے کہ اس دنیا میں اپنے رب کی جو شانیں اور عظمتیں ہم ہر وقت دیکھتے ہیں ان کے دیکھتے ہمیں اپنے بارے میں یہ خوش فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ ہم بہت بڑی چیز ہیں۔ جس زمین پر ہم چلتے ہیں اس کی وسعتوں کا حال یہ ہے کہ اس کے اندر ہماری حیثیت ایک چیونٹی اور ایک مکھی سے زیادہ نہیں ہے۔ جن پہاڑوں کے نیچے ہم رہتے ہیں اُن کی بلندی آسمانوں کو چھوتی ہے اور ہم ان کے آگے ایک ذرۂ ناچیز کی حیثیت بھی نہیں رکھتے۔ جن سمندروں سے ہم گھرے ہوئے ہیں ان کے مقابل میں ہمارا وجود ایک قطرے کے برابر بھی نہیں۔ اس ماحول میں اگر ہم اپنے آپ کو کوئی بڑی چیز سمجھ کر اپنے اوپر فخر کرنے لگ جائیں اور اس زمین پر اترا کر چلیں تو اس کی مثال ایسی ہی ہوگی کہ کوئی چیونٹی غرور میں مبتلا ہو کر زمین پر پاؤں مار کے چلے۔ ایک قصہ ہے کہ کوئی مکھی ایک بیل کے سینگ پر جا بیٹھی۔ بیل کو بھلا اس کا کیا احساس ہوتا۔ لیکن مکھی اپنے آپ کو بہت بڑی چیز سمجھ رہی تھی۔ اس وجہ سے اس نے کچھ دیر کے بعد نہایت بزرگانہ انداز میں بیل سے پوچھا کہ اگر تمھاری گردن میرے بوجھ سے ٹوٹی جا رہی ہو تو میں یہاں سے اڑ جاؤں۔ بیل نے اس کو جواب دیا کہ آپ شوق سے تشریف رکھو۔ مجھے تو اب خبر ہوئی ہے کہ آپ میری سینگ پر تشریف فرما ہیں! اسی روایتی مکھی کی طرح بہت سے لوگ اپنے آپ کو بہت بڑی چیز سمجھ بیٹھتے ہیں، جس سے ان کی چال میں ایک شانِ کبریائی پیدا ہو جاتی ہے۔ وہ چلتے ہیں تو زمین پر پاؤں دھمکتے ہوئے چلتے ہیں۔ گردن ٹیڑھی اور اونچی رکھتے ہیں۔ بولتے ہیں تو کرخت لب و لہجہ میں بولتے ہیں۔ اس طرح کے پرغرور غلط لوگوں کے اندر احساسِ شرم کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو آگاہ فرمایا ہے کہ ﴿وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا إِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْأَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُولًا﴾ (بنی اسرآئیل ۱۷: ۳۷) (اور زمین میں اکڑ کر نہ چلو، نہ تم زمین کو پھاڑ سکتے ہو اور نہ پہاڑوں کے طول کو پہنچ سکتے ہو)۔ مطلب یہ ہوا کہ جب تم خدا کی یہ عظیم

شا ہیں اور قدر میں دیکھتے ہو جن کے آگے تم ایک ذرۂ ناچیز ہو تو تمھیں اس کی زمین میں سر اونچا کرنے سے شرمانا چاہیے۔ ایاز قدر خود بشناس!

اس احساسِ شرم کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ انسان کو یہ حقیقت ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہیے کہ اس کے پاس جتنی قوتیں اور صلاحیتیں اور جتنے اسباب و وسائل ہیں، سب اللہ تعالےٰ کے بخشے ہوتے ہیں۔ ان میں سے نہ کسی چیز کا وہ خالق ہے اور نہ خدا کی عنایت کے بغیر ان کو قائم ہی رکھ سکتا ہے۔ اگر یہ حقیقت برابر اس کے پیش نظر رہے تو لازماً یہ شرم بھی برابر دامن گیر رہے گی کہ کوئی ناشکری یا نافرمانی یا سرکشی اس سے صادر ہوئی تو لازماً وہ انہی قوتوں اور صلاحیتوں اور انہی اسباب و وسائل کے ذریعہ ہوگی جو خدا کے بخشے ہوئے ہیں۔ جس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہوئے کہ اللہ تعالےٰ نے جو نعمتیں اس کو اس لیے بخشیں کہ وہ اس کا شکر گزار اور فرماں بردار بندہ بن کر زندگی گزارے وہ اس نے اس سے بغاوت اور غداری کے لیے استعمال کیں گویا غلام نے آقا کے بخشے ہوئے آلات و ادوات سے آقا ہی کے گھر میں نقب لگائی۔ نعمتوں کے شعور کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے شرم ساری کا یہ احساس ایک امرِ فطری ہے۔ جس کے اندر یہ احساس نہ ہو وہ ایک کمینہ اور لئیم انسان ہے۔ قرآن نے اس حقیقت کی طرف اتنی کثرت سے توجہ دلائی ہے کہ اس کے حوالے نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

بعض لوگ اپنے دین داری کے کاموں کو بڑی اہمیت دے بیٹھتے ہیں اور اپنے زعم میں وہ اللہ اور رسول کے محسن بن جاتے ہیں۔ اس طرح کے لوگوں کو سوچنا چاہیے کہ کوئی بڑی سے بڑی چیز بھی جو اپنے رب کے حضور میں کوئی پیش کرتا ہے کیا اس کی اپنی ہوتی ہے؟ اگر اس نے اپنا سارا مال خدا کی راہ میں لٹا دیا تو یہ مال خدا ہی کا دیا ہوا تھا۔ اگر کسی کو یہ غلط فہمی ہو کہ یہ اس نے اپنی صلاحیت و قابلیت سے حاصل کیا تھا تو اُسے یہ بھولنا نہ چاہیے کہ یہ قابلیت و صلاحیت بھی کوئی اپنے گھر سے نہیں لاتا، بلکہ یہ بھی اللہ تعالےٰ ہی بخشتا ہے۔ مال تو درکنار اگر کوئی شخص اپنی جان بھی، جس سے بڑی انسان کے پاس کوئی اور چیز نہیں ہے، اللہ کی راہ میں قربان کر دے تو اس پر بھی فخر کرنے کے بجائے اعترافِ تقصیر ہی کرنا چاہیے کہ

؎ جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

یہی اعترافِ تقصیر و خجالت بندے کا اصل سرمایہ اور یہی تمام عبادت و اطاعت کی روح ہے۔ قرآن میں بھی اس کی طرف اشارات ہیں اور بعض عارفوں نے بھی اس کا اظہار کیا ہے۔ قرآن میں منافقین کے متعلق بیان ہوا ہے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ اور رسول کا محسن سمجھتے ہیں کہ وہ اسلام لائے ہیں۔ ان کو

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے جواب دلوایا گیا ہے کہ تم میرے اوپر احسان نہ جتاؤ کہ تم اسلام لائے، بلکہ یہ تمھارے اوپر اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ اس نے تمھاری رہنمائی اسلام کی طرف فرمائی۔

اس خصلت کی تربیت کا طریقہ:

اب اس سوال پر غور کیجیے کہ جب اس حیا کی دین میں یہ عظمت و اہمیت ہے تو اپنے اندر اس کے پیدا کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

اس کا جواب ہمارے نزدیک، جیسا کہ ہم نے تمہید میں اشارہ کیا، یہ ہے کہ اس کی تربیت میں اصلی عامل کی حیثیت اللہ تعالیٰ کی صفات کو ہے، جس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہوئے کہ جو شخص اس صفت کو اپنے اندر پیدا کرنا چاہے وہ اپنے دل و دماغ کے اندر اللہ تعالےٰ کی صفات کو برابر مستحضر رکھنے کی ممارست کرے۔ یہ کام نہایت دقیق اور مشکل ہے اس لیے کہ ان صفات کا استحضار پورے شعور کے ساتھ مطلوب ہے۔ صرف اتنی چیز اس مقصد کے لیے کافی نہیں ہوگی کہ آپ اللہ تعالےٰ کے اسمائے حسنیٰ کو یاد کر چھوڑیں اور خاص خاص اوقات میں ان کا ورد کر لیا کریں۔ ثواب کے پہلو سے چاہے اس کی کچھ اہمیت ہو، لیکن پیشِ نظر مقصد کے لیے یہ چیز بے سود ہوگی۔ اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ ان اسمائے حسنیٰ کا جو عکس انسان کی زندگی پر پڑنا چاہیے وہ عکس ہر زاویہ سے پڑے۔ تزکیہ کے نصب العین کے لئے اصل مطلوب شے یہی ہے اور یہ چیز قرآن و حدیث کے تدبر کے سوا اور کسی راہ سے بھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہی دو چیزیں ایسی ہیں جن میں اللہ تعالےٰ کی صفات کا ربط انسان کی زندگی کے ساتھ پوری طرح واضح کیا گیا ہے۔ اس وجہ سے ان کا عمیق مطالعہ اس مقصد کے لیے ضروری ہے۔

اگر اس جہاد کا حوصلہ کوئی شخص نہ کر سکتا ہو تو پھر ادنیٰ درجے میں وہ یہ طریقہ بھی اختیار کر سکتا ہے کہ ان لوگوں کی معیت و رفاقت تلاش کرے جو اس صفت کے حامل ہوں۔ اچھی صحبت بڑی نعمت ہے بشرطیکہ حاصل ہو سکے اور اگر حاصل ہو جائے تو آدمی اس کو نباہ سکے۔ اگرچہ ایسی صحبت کا حصول کچھ مشکل نہیں ہے، لیکن حق کے طالبوں کے لیے اللہ تعالےٰ کا وعدہ ہے کہ وہ ان کی رہنمائی فرمائے گا۔ اس وعدے پر اعتماد کر کے جو شخص پورے عزم و خلوص کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوگا اُمید ہے کہ اللہ تعالےٰ اس کو کسی خضرِ راہ سے ملا دے گا: وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ط (العنکبوت-۲۹: ۶۹) (اور جو لوگ ہماری راہ میں مشقتیں جھیل رہے ہیں ہم ان پر اپنی راہیں ضرور کھولیں گے)۔

یہ صفت ایک بڑی گراں بہا متاع ہے۔ اس کی شان میں حضورؐ کا ارشاد ہے کہ من استحیٰ

باقی ص۳۹ پر

مراسلہ و مذاکرہ

امین احسن اصلاحی

تصوّف اسلام کے متوازی ایک دین ہے

سوال :- ہمارے ہاں جو تصوف رواج پا چکا ہے اس کو قرآن کے مطابق ڈھالنے کے لئے کیا اقدامات ضروری ہیں ؟

جواب :- تصوف کے متعلق یہ بات یاد رکھیے کہ یہ ایک الگ دین ہے جس کا منبع و ماخذ قرآن نہیں۔ اس میں توراۃ اور انجیل کی تعلیم بھی ملتی ہے۔ بدھا کے فلسفے کی جھلک بھی موجود ہے، یونانی فلسفہ کے آثار بھی ہیں اور ہندو فلسفہ کی باتیں بھی پائی جاتی ہیں۔ جہاں جہاں سے اہل تصوف کو جو بات بھی اپنے ذوق کی ملی ہے وہ انھوں نے لے لی ہے۔ چنانچہ قرآن و حدیث میں بھی جو چیز انہیں اپنے ذوق کی ملی ہے وہ انھوں نے اس میں ڈال لی ہے لیکن آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ تصوف کی بنیاد قرآن و حدیث پر ہے لہذا کل کے کل تصوف کو صحیح ماننا درست نہیں، یہ رطب و یابس کا مجموعہ ہے اس میں خیر بھی ہے اور شر بھی اور مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا شر اس کے خیر پر غالب ہے۔

اہل تصوف نے اپنے دین کے لئے الگ اصطلاحیں وضع کی ہیں جو اُن اصطلاحوں سے مختلف ہیں جو دین اسلام میں رائج ہیں۔ تصوف کا لفظ قرآن میں نہیں ہے اسے صوفیاء نے خود اختراع کیا ہے۔ وہ اس کے علم کو شریعت کی بجائے "طریقت" کہتے ہیں۔ اس علم کے جاننے والوں کے لئے وہ علماء اور فقہاء کے الفاظ استعمال نہیں کرتے بلکہ غوث، قطب اور ابدال کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔ تصوف کے بیشتر سلسلے اپنا آغاز حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مانتے ہیں اور ان کا دعویٰ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ وسلم کچھ راز کی باتیں صرف ان کو بتا گئے۔ دوسرے جلیل القدر صحابہ کرام کا ان سلسلوں میں نام تک نہیں آتا۔ بسا اوقات حضرت ابو ہریرہؓ کا نام لیا جاتا ہے لیکن معلوم ہے کہ وہ اس کوچے کے آدمی نہیں تھے۔ وہ تو حدیث کے راوی تھے، تصوف سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

یہ بات بھی یاد رکھئے کہ اہل تصوف کے ہاں علم کا راستہ ہمارے علم کے راستے سے مختلف ہے۔ ہمارے ہاں تو یہ ہے کہ ہم اللہ تعالےٰ کو اس کی صفات کے ذریعہ سے جو اس نے ہمیں قرآن میں بتائی ہیں مانتے ہیں۔ ہمارے پاس خدا کی ذات سے واقف ہونے کا کوئی ذریعہ نہیں۔ ہم اس کی صفات ہی کو

جان سکتے ہیں کیونکہ صفات کے معاملہ میں کچھ چیزیں ہمارے اور اس کے درمیان مشترک ہیں، وہ علیم ہے تو علم کا کچھ شائبہ ہمیں بھی دیا ہے، وہ رحمان و رحیم ہے تو رحم کا کچھ شعور ہمیں بھی بخشا ہے، لیکن اس کی ذات کی کوئی چیز ہمارے درمیان مشترک نہیں۔ لیکن اہل تصوف کا دعویٰ ہے کہ وہ خدا کی ذات تک پہنچتے ہیں اور اس کے لئے مختلف مقامات طے کرتے ہیں۔

ہمارے ہاں علم حقیقی کا ذریعہ پیغمبر ہے۔ ہم قرآن مجید کو ہدایت کی کتاب سمجھتے ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال سے رہنمائی پاتے ہیں اگر کسی مسئلے میں قرآن و حدیث میں کوئی چیز نہیں ملتی، تو ہم اجتہاد کرتے ہیں۔ لیکن اس کے بعد ہم بے بس ہو جاتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے پاس علم کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ اس کے برعکس ارباب تصوف کے نزدیک علم کا اصلی ذریعہ کشف و الہام ہے جو وہ اپنے دعویٰ کے مطابق خدا کی ذات سے پاتے ہیں۔ کشف و الہام ہونے کو تو شہد کی مکھی کو بھی ہوا اور حضرت موسیٰؑ کی والدہ کو بھی، لیکن اس کو مستقل ذریعہ علم ماننا اس لئے بعید از فہم ہے کہ ہمیں کوئی ایسی کسوٹی نہیں بتائی گئی جس سے یہ جانچا جا سکے کہ جو الہام ہو رہا ہے وہ الہام ربانی ہے، الہام شیطانی نہیں۔

دین کی بنیاد تمام تر عقل پر ہے بشرطیکہ عقل میں یہ خرابی نہ ہو کہ وہ رشوت لے لیتی ہے، بعض اوقات ڈر جاتی ہے کبھی ذرا کسل مند ہو جاتی ہے۔ تو عقل نہایت ہی کار آمد شے ہے۔ میرے نزدیک ایک عاقل آدمی سے اگرچہ وہ ملحد ہو، بحث ہو سکتی ہے کیونکہ عقل مند تو وہ بات کہے گا جو عقل کے مطابق ہو گی اور عقل کا کچھ حصہ ہمارے پاس بھی ہے۔ اس لئے ہم اس سے بحث کر کے اپنی بات منوا سکتے ہیں، لیکن ایک صوفی سے کوئی بحث نہیں ہو سکتی، کیونکہ وہ مقامات کی بات کرتے ہیں کہ ہم فلاں مقام تک گئے اور یہ دیکھا اور فلاں مقام پر پہنچے تو وہ دیکھا، چونکہ ان کے دین کی بنیاد انہی چیزوں پر ہوتی ہے اس لئے نہ آپ ان کی بات کو سمجھ سکتے اور نہ انھیں اپنی بات سمجھا سکتے ہیں۔ وہ عقل و نقل کو کوئی اہمیت نہیں دیتے لہذا ہمارے اور ان کے درمیان کوئی چیز مشترک نہیں رہ جاتی۔

صوفیاء نے جس طرح شریعت کے مقابلے میں طریقت کا لفظ اپنایا ہے اسی طرح انھوں نے محبت کے لئے عشق کا لفظ اختیار کیا ہے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ فلاں حضرت عشق الٰہی میں مست ہیں۔ ہر قوال، ہر نعت خواں اور ہر گویے کیلئے یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔ عشق کا لفظ نہ قرآن مجید میں کہیں آیا ہے نہ حدیث شریف میں۔ یہ لفظ اختیار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ صوفیاء کو قرآن و سنت کے مقابلے میں اپنی اصطلاحیں وضع کرنے کا نہ صرف شوق ہے بلکہ وہ اُن کو قرآن و سنت کی اصطلاحوں کے مقابلے میں بلند ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اب واقعہ یہ ہے کہ عشق کے لفظ میں ایک آوارگی پائی جاتی ہے، اس کے لئے کوئی کسوٹی اور معیار

نہیں ہے۔ عشق اور عقلِ دماغ میں امتیاز کرنا بھی مشکل ہے۔ اس کے برعکس قرآن و حدیث میں محبت کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے لئے کسوٹی موجود ہے جس پر پرکھ کر یہ بتایا جا سکتا ہے کہ کون شخص خدا سے محبت کرتا ہے اور کون محبت نہیں کرتا۔ سب سے بڑی کسوٹی تو ہمارے پاس قرآن مجید ہے جس پر آپ بھی تول اور پرکھ سکتے ہیں مثلاً ایک شخص کے سامنے ایک ایسا موڑ آئے جہاں اُسے یہ فیصلہ کرنا پڑے کہ میں وہ بات اختیار کروں جو میرے اپنے مفاد، میرے دوستوں کے مفاد اور میرے خاندان کے مفاد میں جاتی ہے یا وہ بات اختیار کروں جو خدا کو پسند ہے اگر ایک بندہ اپنے خاندان اور اپنے مفاد سب کو چھوڑ کر خدا کی بات کو اختیار کرے تو وہ خُدا کا محبوب و محب ہے اور اگر دوسرا راستہ اختیار کرے تو وہ منافق ہے۔ قرآن نے خدا تعالیٰ کی اعلیٰ ترین محبت کا نمونہ بھی ہمارے سامنے رکھ دیا ہے اور وہ پیغمبرؐ کی پیروی ہے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اپنے عمل سے نہایت واضح کر دیا ہے۔ ایک مرتبہ کچھ لوگوں نے خورد و نوش، آرام اور نکاح وغیرہ جیسے معاملات میں تقویٰ کا کچھ زیادہ مظاہرہ کیا تو آپ نے فرمایا کہ میں تم سے زیادہ اللہ سے محبت کرنے والا اور تقویٰ اختیار کرنے والا ہوں، اگر میں یہ کام کرتا ہوں تو تمھیں ان کو ترک کرنے کی ضرورت نہیں۔ میرے عمل کے اندر تمھارے لئے نمونہ ہے۔

میں نے صوفیاء کے بارے میں خود پڑھا ہے کہ انھوں نے ترکِ غذا پر عمل کرنا شروع کیا اور ان کی غذا صرف ایک ماشہ رہ گئی۔ سوال یہ ہے کہ حضور اکرمؐ نے بھی ایسا کیا ہے؟ ابو بکر صدیقؓ اور عمر فاروقؓ نے ایسا کیا ہے؟ کیا پیغمبرؐ کا نمونہ ادنیٰ اور گھٹیا ہے جس کو چھوڑ کر آپ اپنے لئے ایک بلند معیار مقرر کرتے اور اُسے نیکی سمجھتے ہیں۔

تصوف میں اصحابِ علم صرف چند ایک ہیں مثلاً شاہ ولی اللہ ایک ذی علم آدمی ہیں، غزالیؒ ایک پڑھے لکھے آدمی ہیں، ابو اسماعیل ہروی کا شمار حنبلی علماء میں ہوتا ہے۔ یہ لوگ قرآن و حدیث سے واقف ہیں۔ میں نے ان سب کی کتابیں پڑھ رکھی ہیں اور ان کو پڑھنے کے بعد میں تصوف پر تنقید کرتا ہوں۔ اس مطالعے سے میں اس نتیجہ تک پہنچا ہوں کہ تصوف کا اکثر حصہ قرآن و سنت کے بالکل خلاف ہے۔ اس نے توحید اور آخرت کے عقائد کی بنیادیں ہلا دی ہیں، مسلمانوں کو بدعات کے گورکھ دھندے میں ڈال دیا ہے۔ جو چیز عقائد کی بنیادیں ہلا دے اس کو آپ قرآن سے نہیں جوڑ سکتے۔ اس کے لئے ایک ہی طریقہ ہے کہ آپ بحیثیت مسلمان قرآن کو کسوٹی مانیں اور تصوف کو اس پر پرکھیں اور اتنے حصہ کو مان لیں جو اس کسوٹی پر پورا اترتا ہو۔ قرآن مُھیمن ہے۔ اس پر پرکھے بغیر تو کوئی حدیث بھی نہیں مانی جا سکتی، حالانکہ حدیث سے زیادہ افضل کوئی اور

باقی صـ ۱۹ پر